چھوٹی کہانیوں کا مجموعہ

واقعہ ایک دیوار کا

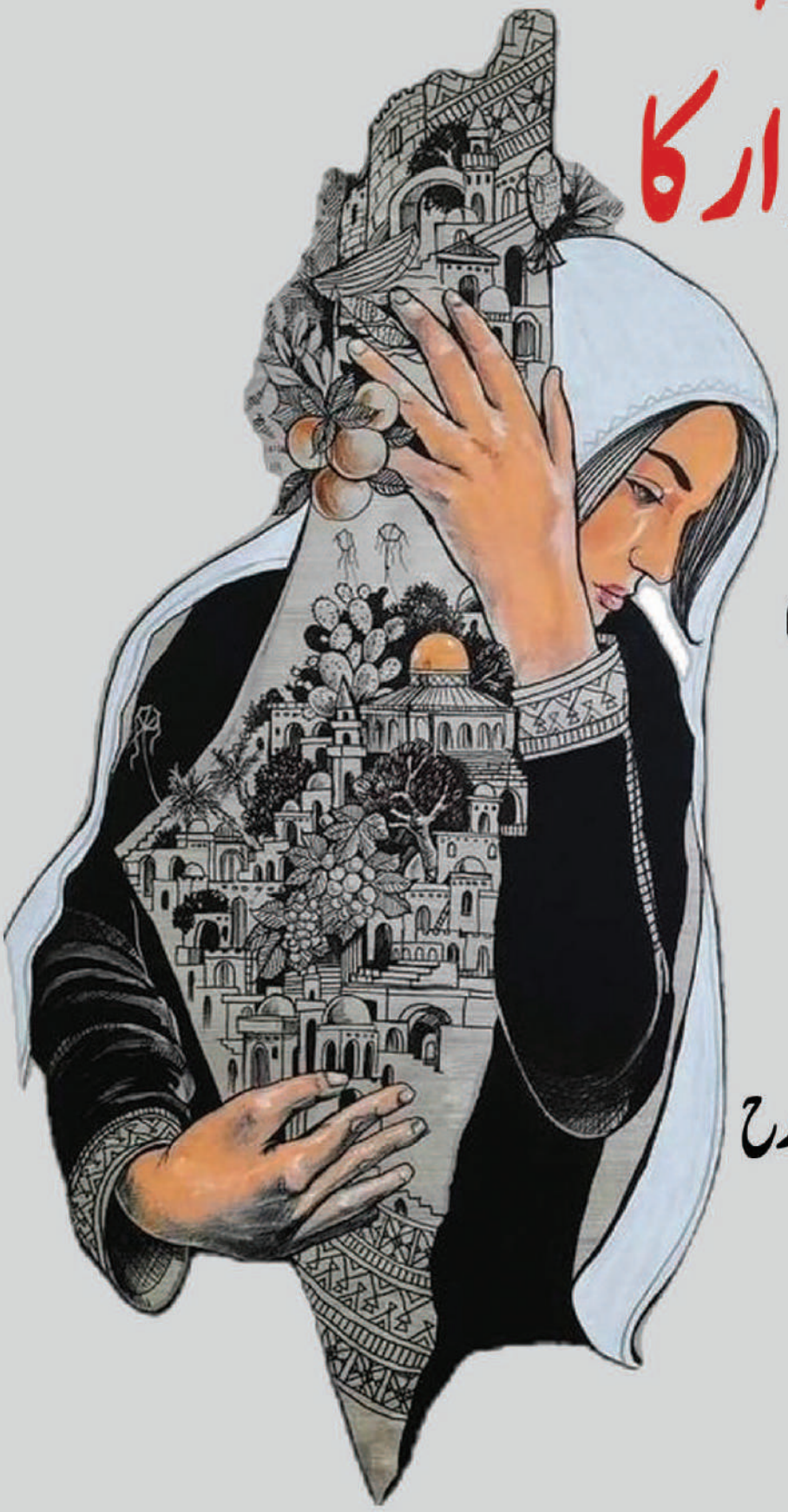

ڈاکٹر: سناء شعلان
(بنت نعیمہ)

ترجمہ: ڈاکٹر: لبنیٰ فرح

واقعہ ایک دیوار کا

Book Title: واقعہ ایک دیوار کا مُترجم عن الأصل العربي (حدث ذات جدار)
First Edition: 2025
Author:Professor. Sanaa Shalan (bint Na,imah) ڈاکٹر: سناء شعلان (بنت نعیمہ)
Translated by: Lubna Farah ڈاکٹر: لبنیٰ فرح
Book type: story collection
Number of pages: 152
Filing number: (2024/8/4881)
Classification number: 813.9
ISBN :978-9957-545-80-2
Descriptors: /Arabic Stories//Arabic Literature//Urdu Language//Translated Literature/
All rights reserved to the author: Professor. Sanaa Shalan (bint Na,imah)
Author's address: Professor. Sanaa Shalan Jordan, Amman, Post code: 11942 P.O. Box: 1351 Mobile, WhatsApp and Viber: 00962795336609 selenapollo@hotmail.com Facebook: Sanaa Shalan Youtube:Sanaa Shalan
Publisher data: (TNOOR Cultural CenterAL) Al tnoor Kulttuurinkeskus ry Väinölänkatu 19 B 38 33500 Tampere Finland Hassan Abbas .Dakhel altnoor62@gmail.com
Printing press: Al tnoor Kulttuurinkeskus ry Press Finland – Tampere – 33500
design: Asma Jaradat - Asma Office for Design and Directing

- The author bears the full legal responsibility for the contents of this publication. This publication does not reflect the views of the National Library Department or any other government department.
- The primary indexing and classification data was prepared by the Department of National Library.
- All rights reserved to the author Professor. Sanaa Shalan (bint Na,imah) . No Part of this book may be reprinted, photocopied, translated or entered into a computer or translated into a disk without the permission of the author.

چھوٹی کہانیوں کا مجموعہ

واقعہ ایک دیوار کا

ڈاکٹر: سناء شعلان (بنت نعیمہ)
ترجمہ: ڈاکٹر: لبنیٰ فرح

پہلی اشاعت

2025

اشاریہ

اشاریہ 5
لگن 7

دیوار کے قریب

تاریکی پر روشنی 11
دیوار نے پکارا 13
قبرستان 23
زچگی کی حیثیت 28
رازدار دوست 34
ایک دیوار پر سورج اور بارش 44
آخری شمع کس نے بجھادی؟! 54
جب چھٹی نہ ملے 62
چیخوں سے بھری ہوئی وادی 74
غروبِ آفتاب چھپتا نہیں 84
نور کا نسب 91
دیوار نے کیا کہا؟ 97

دِیوار سے دُور

کمپاس، کیل اور بارش کے قطرے 117
توہم پرست ابو عرب کا افسانہ 130

لگن

میری مرحوم فلسطینی والدہ (بنت نعیمۃ) کو، جو میرے دل کا
لازوال سرمایہ ہے، جس نے مجھے صبر، استقامت، ایثار
اور ہمت کے معنی سکھائے اور میرے دل میں اپنے وطن
فلسطین کی محبت کا بیج ڈالا.
اس کی پاکیزہ روح پر الفاتحہ

دیوار کے قریب

تاریکی پر روشنی

علیحدگی کی دیوار یا دیوارِ علیحدگی ایک طویل قسم کی رکاوٹ ہے جسے صہیونی ادارے نے مقبوضہ فلسطین کے مغربی کنارے میں گرین لائن کے قریب تعمیر کیا ، تاکہ مغربی کنارے کے فلسطینی باشندوں کو صہیونی بستیوں میں داخل ہونے سے روکا جاسکے۔ [1]گرین لائن کے قریب یہ رکاوٹ ایک باڑ اور کچھ گشتی سڑکوں پر مشتمل ہے، جیسے کہ مثلث کے علاقے یا یروشلم کے علاقے میں باڑ کے بجائے کنکریٹ کی باڑیں ہیں۔

اس دیوار کی تعمیر 2002 عیسوی میں الاقصیٰ انتفاضہ کے دوران شروع ہوئی تھی اور 2006 عیسوی کے آخر میں اس کی لمبائی 402 کلومیٹر تک پہنچ گئی تھی جوکہ مغربی کنارے کے بیشتر علاقوں سے گزرتی ہے اور

---

(1)- کالونی تعمیر نو کے معنی رکھتی ہے، لیکن صہیونی ادارہ کرائے کے صہیونی تارکین وطن کو رہائش دینے کے لیے سرزمینِ فلسطین پر جو کچھ تعمیر کرتا ہے، وہ اس کالونی سے زیادہ کچھ نہیں جو جبر کے ذریعے فلسطینیوں کی سرزمین اس کے لوگوں سے

زریعے یہ سب کچھ بگاڑ دیتی ہے، تو اس لیے یہ کالونی نہیں ہے۔

بعض جگہوں پر قلقیلیہ کا شہر جو کہ یہودی بستیوں پر مشتمل ہےیعنی ایک شہر یا قصبوں کا ایک گروہ جو تقریباً چاروں طرف سےایک دیوار سے گھرا ہوا ہے۔
فلسطینی نیشنل اتھارٹی اور فلسطینی تنظیمیں اگرچہ اس دیوار کی تعمیر کی مخالفت کرتی ہیں اور اسے "اپارتھائیڈ علیحدگی کی دیوار" یا "برصغیر کے الحاق کی توسیعی دیوار" کا نام دیتی ہیں۔ لیکن دوسری طرف،صہیونی ادارہ اس دیوار کی تعمیر کو جاری رکھنے کا عزم رکھتا ہے تاکہ وہ فلسطینی آبادی کی زندگیوں میں رکاوٹ ڈال سکے اور مغربی کنارے کی اراضی کو صہیونی ادارے کے ساتھ الحاق کرنے کی صہیونی کوشش کے طور پر جاری رکھ سکے۔

(1)
دیوار نے پکارا

اُنہوں نے ایک ایسے دن میں جنم لیا تھا جو خوف، ناانصافی، ظلم اور محرومی سے بھرپور تھا اور یہ ایسا دن تھا جو انکل نور کی آنکھوں سے برسا تھا۔ لکڑی کی پالکی، فلسطینی پرچم میں لپٹی، اور ابدیت کی تسبیح کے ساتھ ماتم ؛" میرا رب عظیم ہے۔"

وہ ایک لڑکا اور ایک لڑکی تھے جو اپنے بہادر، کمانڈر چچا کو الوداع کرنے کے لیے موجود تھے جنہوں نے اپنی ماں، فلسطین کے لیے اپنی جان قربان کی تھی اور اب اپنی آخری آرام گاہ کی طرف جا رہے تھے۔وہ دونوں وہاں ان کے استقبال کے طور پر موجود نہیں تھے بلکہ وہ اپنی زندگی کے ابتدائی ایام سے ہی یہ سنتے آ رہے تھے کہ ان کے والدین کے درمیان کوئی تنازعہ تھا۔ دونوں نوزائیدہ بچوں کے لیے تجویز کی بنیاد پر یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ ان کا نام "نور" رکھا جائے گا۔ ان

کی والدہ،اور دادی، جو تنازعہ کو ایک ایسے سمجھوتہ کے ساتھ حل کرنا چاہتی تھیں جس سے ان کے دونوں بیٹوں کو ایک ہی وقت میں اطمینان حاصل ہو۔

وہ دونوں اپنی پیدائش سے ہی جڑواں بچوں کی طرح رہتے تھے اور ایک ساتھ سوتے جاگتے تھے۔ حالانکہ وہ شروع سے ہی اس بات سے واقفیت رکھتے تھے کہ وہ آپس میں کزن ہیں لیکن اُن کے لڑکی یا لڑکا ہونے کے بارے میں کوئی پہچان نہ پاتا کیونکہ دادی اماں اُن کے احتجاج کے باوجود انہیں ایک جیسے کپڑے پہنانے کی عادی تھیں، چاہے وہ لڑکوں کے یونیفارم ہی کیوں نہ ہوں یا لڑکیوں کے کپڑے۔ اصل میں اُن کی دادی اماں کے پاس جو کچھ دستیاب تھا وہ ان میں سے ہی اُن کو پہناتی تھیں اور زیادہ تر یہ کپڑے اُن کے باقی پوتے پوتیوں کے کپڑوں سے ملتے جلتے ہوتے تھے۔ وہ انہیں ان ملتے جلتے، گھٹیا، وراثت میں ملنے والے کپڑوں میں خوشی سے اڑتے دیکھ کر بے حد طمانیت محسوس کرتیں ۔ حالانکہ یہ تمام ملبوسات اب اپنا اصلی رنگ و روپ کھو چکے تھے کیونکہ یہ بہت پرانے اور بوسیدہ تھے۔

جب بھی کوئی شخص ' نور ' کا نام لے کر پکارتا تو وہ دونوں بچے شرارت سے مسکراتے ہوئے اس کے پاس پہنچ جاتے تھےکیونکہ انہوں نے شروع سے ہی ہر بات میں شرکت کرنے کا عزم کر رکھا تھا اور اسی وجہ سے کسی بھی پکارنے والے کی آواز کا جواب دیتے ہوئے وہ کبھی الگ ہونے پر راضی نہیں ہوتے تھے چاہے وجوہات کچھ بھی ہوں۔ صرف بیماری ہی وہ واحد قوت تھی جس نے ان کو الگ کر دیا تھا۔ اُس دن دادی اماں جب اپنی پوتی نور کو لے کر ڈاکٹر کے پاس گئیں جو ان کے گاؤں کے پاس ہی تھیں تو انہوں نے اپنے روتے ہوئے پوتے نور سے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ اپنی پوتی نور کوجلد ہی واپس لے آئیں گی۔ لیکن وہ اپنا یہ وعدہ پورا نہ کر سکیں کیونکہ نور کی بیماری نے اسے مزید کئی دن شہر کے ہسپتال میں رہنے پر مجبور کر دیا تھا اور یہ اُس ماہر ڈاکٹر کی ہدایت پر ہوا ۔

اس دوران، نور اپنی کزن نور کے واپس آنے کے انتظار میں بھوک ہڑتال پر چلا گیا تھا۔ اگرچہ اُس کے والد نے اسے دھمکی دی تھی کہ اگر اس نے کھانا نہ کھایا تو وہ

بھوک سے مر جائے گا اور یہ بھی کہ اُس کا چھوٹا پیٹ اور کمزور جسم بھوک برداشت کرنے کے قابل نہیں تھا۔

نور اپنی کزن نور کی واپسی کا ایک طویل عرصے سے انتظار کر رہا ہےلیکن کوئی بھی اس کے اس الجھے ہوئے اور دل دہلا دینے والے سوال کا جواب نہیں دے پا رہا ہےکہ "نور کب گھر لوٹے گی"؟ گھرکا ہر فرد اس وقت اُس ٹھوس کنکریٹ کی دیوار کی وجہ سے مصروف اور پریشان تھا جو راتوں رات ان کے گاؤں کے ارد گرد لگائی گئی تھی۔ جب کہ نور یہ سمجھنے میں کامیاب ہو گیا تھا کہ اس کی دادی اور اس کی کزن نور یقینا اس مضبوط دیوار کے پیچھے قید ہیں۔وہ یہ جان گیا تھا کہ انہیں اپنے گاؤں میں واپسی کے لیے دیوار کا دروازہ عبور کرنے کی اجازت ملنا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہوگا۔ وہ بے حد افسردہ تھا کیونکہ اس ظالمانہ حکمرانی نے اسے اُس کی پیاری روشنی (نور) سے محروم کردیا تھا۔

دیوار اونچی سے اونچی ہوتی گئی اور یہ طویل دن کسی مہلک سستی کے ساتھ گزرتے گئے،اور دوسری طرف

دادی اماں اور نور اس ظالم دیوار کے پیچھے جیسے قید ہو کر رہ گئے تھے۔ وہ ہر صبح صہیونی سپاہیوں کی اجازت کے ساتھ دیوار کی ایک خاص حد تک جاتا لیکن وہ یہ نہیں سمجھ پا رہا تھا کہ اس کے پیارے بغیر کسی سستی اور تھکاوٹ کے اُس سے منہ کیسے موڑ سکتے ہیں؟ وہ اپنی پوری قوت سے نور کا نام پکارتا اس اُمید پر کہ شاید وہ دیوار کے قریب ہو اور اُسے جواب دے دے۔ جب وہ اُس کی مسلسل خاموشی سے تھک گیا تو اُس نے دیوار کو پتھر دے مارا لیکن ساتھ ہی صہیونی سپاہیوں کی وجہ سے اُسے وہاں سے بھاگنا پڑا۔ اس سب کے باوجود نور کی اُمید نہیں ٹوٹی اور وہ روزانہ اپنی کال دوبارہ شروع کرنے کے لیے دیوار کے قریب جاتا رہا۔

جب بھی وہ اپنے غم سے نبردآزما ہوتے ہوئے دیوار کے پیچھے قید اپنی دادی اماں اور اپنی کزن کا انتظار کرتا تو اُس کے والد اکثر اسے پیار بھری مضبوطی سے تھام کر دیوار سے دور لے جاتے تھے۔ اُس کے والد اسے ایک ناقابل تغیر جملے سے دلاسہ دیتے ہوئے فرماتے کہ "تمہاری دادی اماں اور نور بہت جلد واپس

آجائیں گے انشاء اللہ"۔ لیکن جب نور ان کی واپسی کا صحیح وقت جاننے پر اصرار کرتا تو اُس کے والد خاموشی سے رونے میں مشغول ہوجاتے جس سے اُن کی داڑھی بھی گیلی ہوجاتی۔ یہ دیکھ کر اپنے روتے ہوئےاداس والد پر رحم کرتے ہوئے نور اپنے سوال پہ اصرار کرنا چھوڑ دیتا تھا۔

نور کو یہ بھی معلوم تھا کہ اس کی دادی اور اس کی کزن نور دیوار کے پیچھے قصبے میں اپنے ایک رشتہ دار کے گھر رہتی ہیں اور وہ جانتا تھا کہ نور کی صحت پہلے سے بہتر ہو رہی ہے لیکن وہ اس اُمید کا دامن نہیں چھوڑ سکتا تھا کہ وہ دیوار کے پیچھے سے اس کی روزانہ کی کال کا جواب دے کر اُس کی آواز کو ضرور سنے گی۔ اُس نے اپنی پتنگ کو دیوار کے اوپر اڑاتے ہوئے نور کی توجہ مبذول کروانے کے بارے میں سوچا تاکہ وہ اس تک پہنچ جائے یا اس سے اُوپر اٹھ جائے۔اس طرح وہ اسے ہلکی سی نظر آ جائے گی اور وہ جان لے گی کہ وہ اُس کے قریب ترین مقام پر ہے۔ نور کو یہ سب کرنے میں کافی محنت کرنا پڑی اور اُس نے اس کام

کے لیے محلے کے لوگوں سے قرض بھی لیا اور وہ اپنے منصوبے میں تقریباً کامیاب بھی ہو گیا لیکن صہیونی فوجیوں نے اس کے طیارے کو پہلی پرواز میں ہی ضبط کر لیا۔ اور اُسے وہاں دیوار کے گیٹ کے اوپر بنائے گئے مشاہداتی کمرے میں پھانسی دے دی اور اس طرح نور نے اپنی روشنی کے ساتھ بات چیت کرنے کی یہ آخری اُمید بھی کھو دی۔

اُس نے پختہ ارادہ کر لیا تھا کہ وہ دیوار کو اپنی روشنی سے ملے بغیر نہیں چھوڑے گااور وہ یخ سردی کے دنوں میں وہیں دیوار کے پاس ہی کہیں چھپ گیا اور اس کے تمام خاندان کی طرف سے اُسے گھر لانے کی ساری کوششیں ناکام ہو گئیں۔ نور نےاس دوران اپنا یہ وقت دیوار کی ایک طرف سے دوسری طرف بھاگنے میں صرف کیا کیونکہ اُسے خوف تھا کہ وہ اُن لوگوں کے ہاتھوں پکڑا جائے گا جو اسے اُس کے گھر واپس لوٹانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ لیکن اُس نے بھی مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ وہ اپنی کزن نور کے انتظار میں یہ مسلسل پیش آنے والا عذاب بھی سہ لے گاچاہے اُسے

کتنی ہی سردی، کھلی فضا، بھوک، سختی اور اذیت ناک انتظار کا سامنا کرنا پڑے۔ یہ طے تھا کہ وہ اب واپس نہیں آئے گا اور یہ سب کچھ جوانمردی سے برداشت کرے گا۔

صرف 'دیوار' ہی اس راز سے واقف تھی کہ نور اپنے گھر والوں سے چھپ کر کہاں موجود تھا جو اُس کا مسلسل تعاقب کر رہے تھے۔اُس کے گھر والے اس انتظار میں تھے کہ وہ مایوس ہو کرخود ہی لوٹ آئے گا حالانکہ وہ اس کی ضدی طبیعت سے اچھی طرح واقفیت رکھتے تھے۔ ۔ اُس کے پاس اپنی ننھی نور کو سلام کرنے کے لیے کچھ الفاظ ہیں جودیوار کے دوسری طرف فرش پر بیٹھے ہوئے اُس کا انتظار کر رہی تھی اور جس نے اِس سرد رات میں اپنی دادی کے ساتھ اپنے رشتہ داروں کے گھر واپس آنے سے انکار کر دیا تھا۔

جب وہ اپنی کمزوری سے مغلوب ہو گیا تو اُس نے اپنے کندھوں سے اُن کالے بادلوں کو روکنے کی بے سود کوشش کی جوکہ ایک سرداور برسات بھری رات کا اعلان کر رہے تھے۔ لیکن جلد ہی بادلوں نے اُسے آ

دبوچا اور اُس کی واحد پناگاہ کو ڈھانپ کر مکمل طور پر غلبہ حاصل کر لیا۔ شدید بارش اور گرجتے ہوئے بادلوں سے دیوار لڑھک گئی اور دیوار کے دونوں طرف موجود دو معصوم بچے بھی جن کی زندگی کا واحد مقصد اس وقت ایک دوسرے سے ملنا تھا۔ ۔

بارش نے اس جگہ کو مکمل طور پر خاموشی اور بے بسی کی کیفیات سے بھر دیا تھا اوراس کی شدت میں صبح تک بھی کوئی کمی نہ آئی۔جب بارش اپنی ٹھنڈی اور منجمندکرتی بوندوں سے ہر شے کو دھو رہی تھی تو وہیں دیوار بھی اُن دو چھوٹے معصوم بچوں پر بلک بلک کر رو رہی تھی جن کا نام" نور" تھا۔باوجود اس کے کہ دیوار نے اِن کو اپنے ناپاک، کالے، اور ڈسے ہوئے سائے سے ڈھانپ رکھا تھا پھر بھی وہ ان کو محفوظ نہ کر سکی اور ان میں سے ہر ایک 'مردہ' تھا۔۔۔۔

دیوار کو اس وقت اُن دو معصوم بچوں کی موت نے غم اور دکھ سے دوچار کیا ہوا تھا جن کا جرم صرف فلسطینی ہونا تھا اور اِسی جرم نے اُن دونوں کو ایک دوسرے سے محروم کر دیا تھا اور اس لیے دیوار ان دو

چھوٹی کمزور لاشوں کو اٹھانے کے لیے ہاتھ پھیلانے سے قاصر تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے دیوار بھی احساسِ گناہ کا شکار ہو اور اُن دو معصوموں کے قتل کے پچھتاوے میں ڈوب گئی ہو جنہیں ناحق تکبر اور ظلم کے ساتھ موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔

(2)
قبرستان

جب تک صہیونی قبضے کی لعنت اُن لوگوں کے ماضی، حال اور مستقبل کو تباہ کرتی رہے گی تب تک حجاج رشدیہ اپنے فلسطینیوں کے دُکھوں کا شمار نہیں کر سکتیں۔ ان فلسطینیوں میں اُس کے اپنے عزیز و اقارب، پڑوسی اور دوست بھی شامل تھے ۔ قتل، قید، جلاوطنی، اذیت، بیماری، قتل و غارت اور سفاک دشمنوں سے نبردآزمائی کے باوجود وہ پُرعزم ہے اور اُس نے آزادی کے قافلوں میں کبھی بھی اپنے بیٹوں کی تعداد کا ذکر نہ کیا تھا۔

اگرچہ اُس کا دل ہر لمحہ اپنےوجود کے نقصان کو شمار کرتا ہے کیونکہ وہ تین (بیٹے) تو جوانی کی زینت تھے اور پکی ہوئی لذیذ ٹہنیوں کی مانند تھے جب صہیونی دشمن نے اُن پر یکے بعد دیگرے بمباری کی تھی۔ وہ تینوں ا اپنی ماں کی اُمید اور مستقبل تھے جنہوں نے اپنی جوانی کے سال یتیمی اور غربت میں گزارے تھے۔

حجاج رشدیہ کو کبھی کسی نے اپنے کسی بچے کے لیے روتے ہوئے نہیں دیکھا تھا اور اُس کا عزم تھا کہ محلے کے لوگ اُسے شہداء کی ماں کے نام سے پکاریں اور جب بھی وہ اُن کی قبرونپر لگے ہوئے زیتون کے درختوں کو پانی سے سیراب کرتی تو اسے اُن پر بے حد فخر محسوس ہوتا۔

آج جب اُس نے اپنے باغ میں زیتون کے درختوں کو گلے لگایا تو اُسے وہاں رونے اوراپنے آنسو بہانےمیں بالکل شرم محسوس نہ ہوئی۔ اُس نے ان میں سے سب سے بڑے درخت کے تنے کو اس اُمید پر تھام لیا کہ وہ اس کی صہیونی فوجیوں سے حفاظت کرے گی جنہوں نے طلوع آفتاب کے وقت گاؤں پر چھاپہ مارا اور اُس کی زمین کو بلڈوز کرنے سے پہلے وہاں موجود درختوں پر تباہی مچادی۔ انہوں نےزمینوں کی ملکیت کے بہانے اُس کے تمام لوگوں کو ننگے پاؤں اور خوفزدہ حالت میں باہر نکال دیا تاکہ وہ وہاں" علیحدگی کی دیوار" بنا سکیں۔ اُس نے خوب مزاحمت کی اور وہاں سے جانے سے انکار کیا لیکن یہ کوشش بے سود رہی اور اُس کے گھر، باغ،

اورباغ میں موجود زیتون کے بہت سے درختوں سمیت پورےگاؤں کی زیادہ تر زمینیں ضبط کر لی گئیں۔۔۔

اِس طرح زرعی زمینیں بنجر ہو گئیں اور ان میں لگے درخت اور پیڑ بھی نیست ونابود ہو گئے۔ علیحدگی کی دیوار کے منصوبے نے گاؤں کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کے بعد گاؤں کو اس کے آبائی رہائشیوں سے بھی محروم کر دیا تھا۔ ایک چھوٹا سا علاقہ بچا تھا جواپنے لوگوں کے ایک بڑے ہجوم کو اپنے اندر مقید کر رہا تھا اور دوسرا علاقہ اس جگہ کے سامنے تھا جو گاؤں کے قبرستان کو الگ تھلگ کر رہا تھا۔ پورا قبرستان خاردار تاروں، کتوں، رائفلوں اور صہیونی فوجیوں کی مدد سے علیحدگی کی دیوار کے پیچھے خالی ہو گیا تھا۔

گاؤں کی اس غیر منصفانہ اور تیز رفتار تقسیم کے بعد قبرستان میں صرف حجاج رشدیہ ہی رہ گئی تھی کیونکہ وہ وہاں اپنی زمین سے چمٹی رہی اور زندہ ہونے کے باوجود قبرستان کی طرف کوچ کرنے والے اپنے نئے شہداہ سے دُور جانے سے انکار کر دیا۔ اُس نے اپنی اس نئی آرام گاہ میں قبروں میں مدفون اپنے بچوں کی روحوں

سے ہمکلام ہو کر کچھ دن گزارے۔ اپنے زیتون کے درختوں کے درمیان قبرستان کی سرزمین پر بیٹھے ہوئے اُس کے اندر صہیونی فوجیوں کی اس سفاکیت پر نفرت سی اُبل رہی تھی۔ اُس دیوار سے نفرت جو اُسے اس کے گاؤں، اس کے لوگوں اور اس کی طویل تاریخ سے محروم کرنے کے لیے اس کی آنکھوں کے سامنے بے دریغ بڑھتی جا رہی تھی۔

قبرستان اُس کی دنیا کی وہ آخری چیز ہے جو دیوار کے پیچھے ہے اور مظلوم ہے اور یہاں وہ بالکل تنہا ہے اور اُس کے پاس اپنی ہمت اور زندہ رہنے کے عزم کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔۔ اُس کی کلہاڑی وہ واحد چیز ہے جو زیتون کے درختوں کی طرف جانے والے راستے پر اُس کے ہمراہ تھی۔ وہ اپنی اس پرانی کلہاڑی کوغور سے دیکھتی ہے جو ایک طرف پھینکی گئی تھی اور اس کے ہاتھ کی پھٹی ہوئی جلد سے ڈھکی ہوئی لکڑی کے ہینڈل کا جائزہ لیتے ہوئے وہ اسے پکڑتی ہے۔ اُس نے اپنے سر کو مضبوطی سے باندھااور کلہا ڑی کو اپنے لباس کے کناروں سے باندھ دیا۔اُس کے قدم مضبوط اور تیز

تھے،اور وہ اپنی کلہاڑی سے دیوار کو توڑنے اور پست کرنے کے ارادے سے دشمن کے سپاہیوں کے پاس پہنچی جو کلہاڑی اٹھائے ہوئے ایک بوڑھی عورت کے چہرے سے دور بھاگ رہے تھے۔ اُس کا غضبناک انتقام اس کی آنکھوں سے ظاہر ہو رہا تھا جب وہ کلہاڑی لے کر تقریباً دیوارسے ٹکرائی تھی۔دُورافق پر قبرستان اپنی کھلی ہوئی قبروں کے ساتھ کھڑا تھا جسے شہیدوں نے"علیحدگی کی دیوار" کو تباہ کرنے میں مدد کرنے کے لیے حجاج رشدیہ کے آنسوؤں کے احترام میں چھوڑ دیا تھا۔ رشدیہ!

(3)
زچگی کی حیثیت

وہ نہیں جانتی تھی کہ فلسطین میں اس کے گاؤں کی زمین پر' علیحدگی کی دیوار' لگائی گئی ہے اور وہ اس وقت ایک بین الاقوامی خیراتی ادارے سے علاج کی امداد حاصل کرنے کے بعد عرب دارالحکومتوں میں سے ایک اسپتال میں اپنے چھوٹے سے کمرے میں الگ تھلگ ہو کربیٹھی تھی۔ طبی تنظیم کے اہلکاروں نے ایک طویل انتظار کے بعد اُس کےمہلک کینسر کا علاج کیا جس نے اُسے تب اپنی لپیٹ میں لیا تھا جب اُس نے اپنے اکلوتے بیٹے ہاشم کو جنم دیا تھا۔ اس مہلک بیماری کی وجہ سے وہ اپنے بچے کو ایک بار بھی دودھ نہ پلا سکی۔ اپنے حمل کے دوسرے مہینے میں ایک احتجاجی تصادم کے دوران صیہونی سپاہی اُس کے شوہر کو گرفتار کر کے لے گئے تھے لیکن اس کے بعد بھی اُن کے گھر بار بار معائنہ کرنے والے گشت پر حملہ کرنے کے عادی ہو چکے تھے۔ اِس مشکل گھڑی میں اُس کی تین خالاؤں نے بہت ساتھ دیا جو اُس کے ساتھ ہی قیام

پزیر تھیں اور جنہوں نے مضبوط دشمن کے مد مقابل ایک سخت زندگی کے بوجھ کو اُس کے ساتھ بانٹا تھا۔

یہی وجہ تھی کہ اُس کے شوہر کو اُس کی اِس مہلک بیماری یا علاج کے لیے اپنے والد کے ساتھ ملک سے باہر جانے کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ اُس نے اپنے شوہر کی بہنوں کی خواہش کی بنیاد پر اِس خبر کو خفیہ رکھنے کا انتخاب کیا تھا تاکہ اُس کے شوہرکی نظر بندی کے عذاب میں اضافہ نہ ہو اور وہ اُس کے غم اور تکلیف کے نتائج سے بھی مکمل طور پہ بے خبر رہیں۔

وہ ایک طویل غیر حاضری کے بعد اپنے گھر واپس آنے کا خواب دیکھ رہی تھی تاکہ وہ اپنے چھوٹے بچے کو اپنے سینے سے لگا سکے اور اُس کی خوشبو کو محسوس کر سکے۔ اگرچہ اُس کی بائیں چھاتی کینسر جیسی بیماری کی نذر ہو گئی تھی لیکن اِس محرومی کے باوجود وہ گھر واپس آنے اور اپنے پیاروں سے ملنےکے لیے بے تاب تھی۔لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ اُس کا وطن پھر سے چوری ہو گیا ہے، اور اُس کا گھر

خالی ہو گیا ہے، اور اُس کے شوہر کی بہنیں منتشر ہو گئی ہیں۔ دشمنوں نے اُس کے گھر اور زمین پر قبضے کے بعد اُس کے دیگر رشتہ داروں کے گھروں کو بھی ایک بنجر جگہ میں تبدیل کر دیا تھا گیا۔ ایک سیمنٹ کی دیوار جِس نے اُس کے وطن کو تنگ پویلین، چوہوں کے جال اور قید تنہائی میں بدل دیا تھا۔

اپنے چھوٹے بچے کو سنبھالنے کا اُس کا گلابی خواب دُھندلا ہو کر ایک ڈراؤنے خواب میں بدل گیا تھا جس میں وہ اپنی بدصورت، اور ویران یادوں کے ساتھ رہتی تھی اور اب اپنے ہی وطن میں ایک پناہ گزین بن چکی تھی۔ اس وقت وہ اپنے والد کے ساتھ ایک کمرے میں پھنس کر رہ گئی تھی جہاں اُس کے علاوہ دس افراداور بھی آباد تھے۔ ایک بار پھر اُسے درد، تنہائی اور رشتہ داروں سے دستبردار ہونے کے کینسر سے لڑنا پڑا۔

اُس نے دیوار کے پیچھے اپنے خاندان کے پاس واپس جانے کی بے سود کوشش کی، اور اُس کی کوششیں اس وقت مزید تیز ہو گئیں جب اسے معلوم ہوا کہ اُس کے شوہر کو حراست سے رہا کر دیا گیا ہے۔ اُس کے شوہر

نے اپنے گاؤں کے مضافات میں ہی ایک چھوٹا سا گھر خریدا، اور اپنے خاندان کو دوبارہ ملا دیا۔ اب اُس کی بنیادی فکر اپنی بیوی کو اس کے گھر، اس کے خاندان اور اپنے بیٹے کے پاس واپس جانے کی اجازت دینے کا راستہ تلاش کرنا تھی، لیکن وہ... وہ اپنی اِس خواہش کو حاصل کرنے میں بار بار ناکام رہا، اور مایوس اور محرومیوں کے جذبات لیے روز اپنے اداس بستر پر لی جاتا۔

ملنے کا واحد موقع مشکل سے کمایا جانے والا وزٹ پرمٹ حاصل کرنا تھا، اور اگر دھوپ میں سفر نہ ہوتا تو اسے حاصل کر نازیادہ آسان ہوتا۔ آخر کار وہ دن آ ہی گیا جب وہ اپنے بچے کو اپنے سینے سے تھامنے میں کامیاب ہو گئی۔جب اُس نے اپنے بچے کو پرجوش بوسوں سے نوازا تو اسے محسوس ہوا کہ وہ شدید تھکا ہوا ہے لیکن جلد ہی اُس نے ممتا کیزبردست خوشبو اور آغوش کے سامنے اپنے ہتھیار ڈال دیے۔

ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ بچے کی آنکھوں میں قدیم اداسی رچ بس گئی ہے اور اُس کی مہک ان درجنوں

عورتوں کی خوشبو سے بھری ہوئی ہے جو ماں کو کھونے کے بعد اُس کی زندگی کو بربادی سے بچانے کے لیے باری باری اسے دودھ پلاتی تھیں۔ ابھی وہ یہ سب محسوس ہی کر رہی تھی کہ اُس کے شوہر نے اپنے بیٹے کو اُس سے لے کر اپنے گلے سے لگا لیا۔ اگرچہ وہ ابھی اپنے بیٹے کے دیدار سے جی بھر کر سیر نہیں ہوئی تھی لیکن اُس نے اپنے بیٹے کی پیشانی پر ایک فوری بوسہ پرنٹ کرتے ہوئے اُس کے کان میں سرگوشی کی کہ "میں جلد ہی واپس آؤں گی آپ کے پاس"۔۔۔ اُن کی رخصتی کے وقت اُس کے شوہر کے ہاتھوں میں موجود وہ ننھا سا وجود کس قدرٹوٹا ہوا اور کمزور دکھائی دے رہا تھایسے وہ چند ہفتوں میں ایک یا دو صدی کا ہو گیا ہو۔

دو دن گزر گئے تھے اور اُس نے خواب دیکھا کہ وہ اپنے بچے کو دوبارہ سینے سے لگائے ہوئے ہے جب کہ وہ ایک نامعلوم خلا میں بھٹکتی ہوئی تھی لیکن اس کی آنکھوں کی اسیر تھی۔ جب دشمن نے اسے اپنے بچے سے ملنے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا تو اُس نے

خود سے یہ عہد کیا کہ وہ ہر حال میں اس دیوار کو پار کر کے اپنی اولاد سے ملے گی۔

شام کے وقت وہ صہیونی فوجیوں کے ناکوں، خوف اور احتیاط کے باوجود 'علیحدگی کی دیوار 'کو عبور کر چکی تھی، لیکن جب وہ اسے عبور کر رہی تھی تو وہ گولیوں سے چھلنی ایک بے جان لاش تھی۔ صیہونی فوج کے افسر نے تخریب کاری کے جرم میں گرفتار اُس کے مردہ وجود کو اپنے موٹے فوجی جوتوں سے لات ماری اور اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ اسے گیٹ سے دور لے جائیں، اور انہوں نے اسے دیوار کے ساتھ ہی ڈھیر کر دیا۔ اُس کے ہاتھ کی ہتھیلی ابھی بھی اُس کی دائیں چھاتی پر لگی ہوئی تھی، جس سے اُس نے ایک بار جدائی کی دیوار کے دروازے پر اپنے بیٹے کو دودھ پلانے کا خواب دیکھا تھا۔

(4)
رازدار دوست

اِس لفظ "رازدار دوست" کے لغوی معنی کے لحاظ سے تو اُس کا کبھی کوئی دوست نہیں رہاتھا، اور شاید یہ پھٹا ہوا ہونٹ بھی اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ وہ اپنے گھر کے باہر کسی سے بھی کبھی زیادہ قریب نہیں رہااُس کے پھٹے ہوئے ہونٹ کو گھورتے ہوئے کچھ لوگ تو کہتے ہیں کہ یہ پیدائشی خرابی ہے کیونکہ اُس کی ماں نے اسے آنسو گیس کے بموں کی پیچیدگی کے دور میں جنم دیا تھا جو کہصہیونی دشمن کی بربریت کی نشانی ہے۔

اسے اپنی بیماری یا اس پیدائشی کمی کی وجہ معلوم نہیں ہے لیکن اُس نے اپنے ہونٹوں کے بارے میں جو کچھ لوگوں سے سنا اس سے اسے اندازہ ہوا کہ وہ ملک سے باہر کسی بھی عرب دارالحکومت میں ایک آسان پلاسٹک سرجری کے ذریعے اِس سے چھٹکارا حاصل کر سکتا ہے جہاں جدید کاسمیٹک

ک ادویات دستیاب ہیں۔ لیکن یہ ایک ایسا خواب تھا جو اس 'علیحدگی کی دیوار' کی وجہ سے ملتوی کر دیا گیا جس نے اس کے گاؤں کو اور اس کے لوگوں کو الگ تھلگ کر دیا تھا... دنیا اور اس کے لوگ ایک تنگ جغرافیہ میں مقید ہیں، جو تسلسل کے انتہائی مشکل حالات میں بھی زندہ رہنے کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔

اس پھٹے ہونٹ نے اسے فطرت کے قریب کر دیا تھا اوراُس نے لکڑی سے بنی ہوئی ایک بانسری سے دوستی کر لی تھی جو اُس کے دادا نے بہت پہلے اس کے لیے بنائی تھی۔ یہ بانسری ہی وہ واحد دوست ہے جو اس سے منہ نہیں موڑتی اور تنہائی کے لمحات میں اُس کی واحد دوست اور رازدان ہے۔

اگر یہ دیوارِ جدائی نہ ہوتی تو وہ کئی مہینوں پہلےہی اس آپریشن کو انجام دینے میں کامیاب ہو جاتا لیکن وہ ایک ایسے عذاب میں مصلوب ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جو بھی دیوارِ جدائی کے پیچھے اپنا گھر چھوڑ کر جاتا ہے وہ واپس نہیں آ پاتالیکن وہ یہ خواہش رکھتا ہے کہ وہ

اپنی آبائی جگہ پہ واپس آنے کے قابل ہو اور اس لیے اسے اپنے پروں والی اُمید کا انتظار جاری ر کھتے ہوئے مایوس نہیں ہونا چاہیے ۔ وہ اپنی محبوب بانسری کے ہم سنگاپنے خوابوں کو روشن رکھتے ہوئے آنے والے خوبصورت وقت کا انتظار کرتا ہے۔ اُس کی بانسری کی میٹھی موسیقی روح میں اترتی ہے اور اپنے اندر دیوارِ جدائی کو چیلنج کرنے کی بھی صلاحیت رکھتی ہے، اور خوشی سے اُس دور کی طرف اڑان بھرتی ہے، جہاں آزادی کو سلب نہیں کیا جا تا۔

اگرچہ علیحدگی کی دیوار کا کچھ حصہ ابھی بھی کنکریٹکے بغیر ہےبلکہ وہاں خاردار تار لگائی گئی ہے اور ایک بھاری بھر کم محافظ اس جگہ پر باقی دیوار کی طرح سیمنٹ، اسٹیل اور لوہے کو لگانے کے لیے اپنی باری کا انتظار کر رہا ہے۔ یہ دیوار کامشرقی حصہ ہے جو لیموں کے درختوں تک پھیلا ہوا ہے اوراُس صہیونی کالونی کو ظاہر کرتا ہے جو دُور سے آنے والے عجیب وغریب، اور مسخ شدہ چہروں سے زمین پر بیٹھی ہے، تاکہ موت، ظلم، ناانصافی اور تاریخ

پر ظلمانہ ہتھیاروں کی فتح ہو۔ ایک ایسی گھٹیا، ظالم اورسیاسی طاقت جو انسانی جذبات سے مبرا ہے۔

ابتدائی دنوں میں وہ ہر چیز سے دیوار کے ارد گرد کی زنجیر کو توڑنے کی خواہش رکھتا تھا اور اس کام کے لیے متجسس رہتا لیکن بعد میں وہ اس وحشیانہ، متجسس کھیل کے سامنے ہتھیار ڈال کر اپنی اس خواہش پر قابو پالیتا تھاوہاں کے مکینوں کے لیے کوئی لمحہ ایسا نہ تھا جس میں اُنہیں سپاہیوں، کتوں، ہتھیاروں، موت، جھلستی ہوئی زمین، حراستی مراکز،اور درد بھری اذیتوں کا سامنا نہ کرنا پڑا ہو۔ ایک طرف قتل، تباہی، یتیمی، خوف، غربت، محرومی، کرفیو، تنگ گلیاں، پرانے مکانات، اونچی قیمتیں اور مصائب اور دوسری طرف ایک چوتھائی گھنٹے کا آسان پیدل سفر، خوشحالی، عیش و عشرت، امن، سلامتی اور دولت ۔ وہ اِن دونوں زندگیوں کا موازنہ کرتا ہے اور ان مسکراتے، خوشحال، بچکانہ چہروں کو دیکھتا ہے جواس سبز گھاس والے چوک میں مقابلہ کرتے ہیں۔ شور اور ہنسی اسے اُس کے دائمی مصائبکی طرف لے جانے کے لیے کافی ہےجہاں گاؤں

میں غمگین چہرے ہینکیونکہ اُن سب کی خوشیوں کو صیہونیوں کی اندھا دھند چلتی گولیاں اُڑا لے جاتی ہیں۔

وہ اِس خوبصورت دنیا میں رہنے کے کتنے خواب دیکھتا ہے، اور ایک بار پھر سوچتا ہے کہ اسے اپنی اِس دُکھی دنیا کا قیدی کیوں بننا ہے جہاں جدائی کی دیوار موجود ہے؟! وہ بار بار اپنے آپ سے یہ سوال دُہراتا ہے لیکن ہر بار جوابات پہلے سے زیادہ اُلجھے ہوئے ملتے ہیں اور وہ ان سوالوں کو بھی اپنے نامعلوم قسمت والے سوالات میں شامل کرتا جاتاہے۔

اُسے بالکل بھی اُمید نہیں تھی کہ کہیں ایسی دو آنکھیں بھی ہوں گی جو کئی دنوں سے اُسے دیکھ رہی تھیں اور حتی ا لامکان طور پراُس کے قریب جانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اُس نے یہ بھی نہیں سوچا تھا کہ اُس کا چپکے سے کوٹھری میں خیر مقدم ہو گا اور چند قدم کے فاصلے پر موجود وجود کے ہاتھ اُسے اچانک سے آ دبوچیں گے۔ اُس نے احتیاط، خوف، اور بات چیت کرنے کی شدید خواہش کے ساتھ مُڑ کر دیکھا لیکن اُس کا دِل

تقریباًحلق میں آ گیا جب اُس کے کندھے پرکسی کے چھوٹے،اور گرم ہاتھ آئے۔ لیکن ان ہاتھوں کی نرم گرفت اُس کے اور اُس کے لوگوں پر ڈھائے جانے والے ظلم سے بہت مختلف تھی۔ کیونکہ وہ لوگ صیہونیوں کے ہاتھوں ڈھائے جانے والے مظالم کے عادی ہو چکے تھے اور اس وقت بھی اُس کے سامنے ہتھیار ڈالنے اور فرار ہونے کا سوچے بغیر اس کی پناہ میں رہنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ تھا۔

وہ آنکھیں جو اسے دیکھ رہی تھیں اور جو ہاتھ اسے پکڑے ہوئے تھے وہ اُس کی عیش و عشرت کی دنیا کا ایک نوجوان صیہونی ہے جس نے اُس کا وطن چوری کیا تھا۔ وہ اُس کی قربت سے خائف ہو کر یہ سوچ رہا تھا کہ اگرچہ وہ زبردستی دِیوارِ جدائی کے سائے میں رہتا ہے لیکن اُسے اس شخص پر بھروسہ نا کرتے ہوئے اُس سے دُور رہنا چاہیے اور اپنے گھر والوں کے پاس واپس لوٹ جانا چاہیے۔ لیکن اُسے اس کے ساتھ ایک عجیب سی سلامتی نظر آتی ہے اور جیسے اُس کی سرمئی آنکھیںاُسے اپنے ساتھ رہنے کے لیے التجا کر رہی ہوں

اور پکار رہی ہوں کہ مجھ سے دُور مت بھاگو۔ اُس کے دماغ میں اس وقت دو جنگیں چل رہی ہیں اور اُسے اِن دونوں میں سےکسی ایک کے خلاف جیتنا ہے...اور دُوسرا راستہ تلاش کرنا ہے۔ راہنمائی کے لیے یا تو دُور بھاگنا، یا اپنے دل پر یقین کرنا جو اُسے اس صہیونی لڑکے کے ساتھ تھوڑی دیر کے لیے رہنے کی ترغیب دے رہا ہے، اور اُس کی روح اُسے اپنے دل کی سرگوشیوں کے سامنے ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر رہی ہے۔ اُس کا دل اس خوبصورت باغ میں اُس صیہونی کے ساتھ کھیلتے ہوئے سب سے خوبصورت وقت گزار رہا تھا جس کے وہ پہلے صرف خواب دیکھا کرتا تھا۔

کئی ہفتے گزر گئے اور وہ اپنےاِس خفیہ دوست کے ساتھ بے حد خوش تھا کہ آخرکار اُسے ایک ایسا سچا دوست مل گیا تھا جو اس کے بگڑے ہوئے ہونٹوں کو گھورتے ہوئے بھی نہیں شرماتا تھا۔ وہ دونوں ایک جنگجو کیمپ میں ہیں لیکن وہ حیرت اور ملنساری سے بھری ہوئی بچگانہ محبت سے متحد ہیں جو بڑوں کی جنگوں اور جھگڑوں کے تابع نہیں ہیں۔ کالونی کے باغ

میں لگے ہوئے درخت اپنی پیار بھری گفتگو کے علاوہ ہر چیز کے بارے میں عربی اور عبرانی کے مرکب کی بولی بولتے ہیں، جن میں سے ہر ایک کے پاس اس پیار بھری گفتگو کی کافی مقدار ہوتی ہے۔ وہ دونوں چاہتے ہیں کہ وہ بغیر کسی خوف کے گھاس کے میدانوں میں بھاگ سکیں۔ ایک دن وہ اِس دنیا سے نکل کر باغ میں بھاگنے کا فیصلہ کرتے ہیں۔ دونوں کے ہاتھ میں ایک ایک سینڈوچ ہوتا ہے جسے وہ مزے لے کر کھا رہے ہوتے ہیں۔ اِس کے بعد وہ بھاگنے اور کھیلنے کی اپنی پسندیدہ خواہش کو تسلیم کرتے ہوئے دوڑتے ہیں تو ان کی ہانپنے کی آواز تیز ہوتی جاتی ہےاور اِن کے خلفشار کا شور اِردگرد موجود لڑکوں کی آوازوں کو بھی معدوم کر دیتا ہے۔ منظر ایک دم سےبدلتا ہے جب وہاں موجود لوگ ایک بھورے رنگ کے فلسطینی لڑکے کو دیکھتے ہیں جو باغ میں گھس رہا ہے اورایک صہیونی لڑکے کو گلے لگا رہا ہے۔ باغ میں فلسطینی لڑکے کی صہیونی لڑکے کو گلے لگانے کی خبر جنگل میں آگ کی طرح پھیلتی ہےاوربہت سی خونخوار نظریں اُس فلسطینی

لڑکے کو پکڑنے کے لیے گھیر لیتی ہینجو اپنی جگہ پر ساکت ہو جاتا ہےاور اپنی ماں کے اُس حکم کو یاد کرتا ہے جس میں وہ اسے تنبیہ کرتی ہیں کہ وہ بغیر کسی معقول وجہ کے کالونی کے قریب نہ جائے۔ اچانک اس جگہ پر گولیوں کی آواز بلند ہوتی ہےاور پھر تمام کی تمام گولیاں اُس کے پیٹ میں پیوست ہو جاتی ہیں، اور وہ گھٹنے ٹیک کر زمین پر گر جاتا ہے۔ نیچے گرتے ہوئے اُس کی آنکھیں اپنے صہیونی دوست کی آنکھوں میں درد کی تلاش میں ہیں، جو اِس اُمید کے ساتھ اپنی مٹھی کھولتا ہے کہ بندوقیں اُس کے فلسطینی دوست کے جسم پر اپنا جہنم برسانا بند کر دیں گی۔،اور جب وہ بندوقوں کو فائرنگ بند کرنے کے لیے راضی میں ناکام ہو جاتا ہے تو وہ اپنے دوست کے جسم پر خود کو پھینک دیتا ہے اور گولیاں کھانے میں شریک ہوجاتا ہے جو اُن کے جسم میں بغیر کسی رحم کے گھس جاتی ہیں۔

تمام تصاویر اور چہرے غائب ہو جاتے ہیں اور وہ دونوں ایک چھوٹی سی جگہ پر زمین پر گر جاتے ہیں اس طرح کہ صہیونی لڑکے کی نظریں اپنے فلسطینی

دوست کی آنکھوں کے سامنے اُن گولیوں کا کفارہ دینے کے لیے درگزر کرتی ہیں۔ فلسطینی لڑکے کی نظریں دیوارجدائی کی جانب اٹھتی ہیں، جہاں اُس کی ماں کا چہرہ اداسی میں مقید ہوتا ہے---

(5)
ایک دیوار پر سورج اور بارش

وہاں اس جگہ پر موجود کوئی بھی چیز اُسے خوبصورت،اور چمکدار سورج کی یاد نہیں دلاتی سوائے ایک نوجوان فلسطینی کے چہرے کے جسے وہ ہر صبح علیحدگی کی دیوار کے دروازے پر دیکھتی جہاں سے وہ زبردستی گزرتا تھا۔ یہ ہائی وے پر اُس کے کام کی طرف جانے کی جگہ تھی جب اُس نے پہلی بار ایک دھوپ والی صبح میں اس پر نظریں ڈالیں تھیں۔ ان نظروں سے اُس نے جھلسا دینے والی گرمی کی بجائے ایک نرم سی گرمی محسوس کی جو اُسے اب تک جلا رہی تھی

درحقیقت، وہ اپنے بیلجیئم والے بوائے فرینڈ سے دور رہنے، اپنا کام کرنے اور تعلیم حاصل کرنے کے نئے مواقع کی تلاش میں تھی۔ وہ بوائے فرینڈ جس نے اسے دھوکہ دیا ،اُس کے پیسے چرائے، اور اُس کے شرابی سوتیلے باپ سے دُور جو اسے جنسی طور پر ہراساں کرتا تھا۔

وہ یہاں زندگی میں ایک نئے موقع کی تلاش میں آئی تھی، لیکن اسے جبر، خوف اور دن رات کی محنت کے سوا کچھ نہیں ملا۔ اُس نے ہنگری میں بیلے کا مطالعہ کیا، جو اسے بے حد پسند ہے اور یہ اُس کے سنگ مرمر جیسےجسم کے مطابق ہے جو افسانوی پروں کی طرح سرپٹ جاتا ہے۔ جادوئی لباس میں ملبوس ایک گھوڑا جو بادلوں کے درمیان رقص کرنے کے قابل تھا اور اُس نے کبھی یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ اُس کی قیادت کرے گی۔ پے در پے مایوسی، تنہائی، مسلسل ناکامی، اور صہیونی فوج میں رضاکارانہ طور پر واپس آنے کے خوف سے دروازے پر کھڑا ہونا، فلسطینیوں کی زندگیوں کو گننا، اور اس کے قابل قبول جواز کو جانے بغیر نفرت کا تبادلہ کرنا۔ ۔ ان سب کے بعدجب وہ شام کو اپنے گھر لوٹتی ہےتو ٹوٹ کے بکھر جاتی ہے، اور نفرت سے خون کی قے کرتی ہے۔ وہ اپنے خوبصورت چہرے پر لعنت بھیجتی ہے، جو صبح و شام علیحدگی کی دیوار کے اُس لعنتی دروازے پر اس ساری بدصورتی کو گلے لگانے کو تیار ہے۔

اسے اس خیال کو قبول کرنے کے لیے سخت نفسیاتی تربیتی کورس کروائے گئے کہ یہ دیوار اُس کے صیہونی لوگوں کی حفاظت کے لیے تعمیر کی گئی ہے جن سے وہ اپنی وابستگی سے انکار کرتی ہے۔ وہ سطحی طور پر اپنے آپ کو یہ باور کراتی ہے کہ وہ اس دروازے پر اپنی قوم کی خدمت کرنے کے لیے کھڑی ہوئی ہے۔ وہ وحشی فلسطینی جو اِس سرزمین پر بیٹھے ہوئےاپنی ہستی کی حفاظت کے لیے اُن کو کوس رہے ہیں، جسے وہ گہرائیوں سے محسوس کرتی ہے--- جب بھی وہ اپنی فوجی وردی میں کھڑے ہو کر اپنے گیٹ سے گزرتی لاشوں کا جائزہ لیتی ہے تو اسے اپنے آپ سے نفرت سی محسوس ہوتی ہے اور وہ غیر ارادی طور پر فلسطینیوں کی آنکھوں میں اپنے لیےنفرت، ناراضگی اور نافرمانی کی خوشبو سونگھتی ہے اور اسے محسوس ہوتا ہے کہ یہ نفرت، ناراضگی اور انتقام کی خواہش کسی بھی لمحے ایک لاوے کی طرح پھٹ کتی ہے۔

دیوار کےاس دروازے کے بارے میں ہر چیزجو اسے محسوس ہوتی ہے وہ جہنم میں ہے؛ یہ ایک وحشی دروازہ ہے جو دو جلتی ہوئی دنیاوں کو الگ کرتا ہے، اور وہ اِس کی سرپرست ہے۔ اُسے شدت سے احساس ہوتا ہے کہ یہاں اُس کی موجودگی کا کوئی مطلب نہیں ہے---

صرف وہی نوجوان فلسطینی ہے جو جب بھی اُس کے پاس سے گزرتا ہے تواسے اُس کے اندر بغض یا نفرت کی خوشبو محسوس نہیں ہوتی لیکن وہ اُس کی آنکھوں میں دیکھنے سے گریز کرتی ہے۔ اُس کو ایسے لگتا ہے جیسے صرف وہی وہ شخص ہے جس کے پاس اُس جیسی روح ہے جو بارش کی رات میں بھی جذبات اور نرمی کے ساتھ ابلنے کے قابل ہے!

وہ وہ ہے جس نے اس جگہ پر اُس کی موجودگی کو ایک معنی اور مقصد دیا ہے؛ ایک ایسی آسودگی کا احساس جو اُس کے چہرے کے خدوخال سے شروع ہو کر ایک خوبصورت خواب کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اُس کے مردانہ وجیہ جسم کے ساتھ بیلے ڈانس کرنے کا

خواب! کبھی کبھی جب وہ صبح کے کاغذات کی جانچ پڑتال میں مصروف ہوتی تو شفٹ ختم ہو جاتی اور اِس ناخوشگوار واقعے سے بچنے کے لیے وہ سرکاری کاغذات چیک کرنے کے لیے صبح جلدی پہنچنے کی عادی ہو چکی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ زیادہ سے زیادہ وقت کے لیے اُس کے چہرے کو دیکھتی رہے جب تک کہ وہ اپنے ساتھی فلسطینی کارکنوں کے ساتھ کام پرروانہ نہ ہو جائےجو ہر روز اداسی کے دروازے کو پار کرتے ہیں... تباہ شدہ سرزمین میں خوف، اداسی، ذلت اور دروازوں، کراسنگ، چوکیوں، لوڈنگ اور ان لوڈنگ پر لاتعداد گھنٹوں کے انتظار میں زندگی گزارنے کے لیے مصیبت!

اُس نوجوان کی اُس کی زندگی میں موجودگی سےاُس کی زندگی اور بھی حسین ہو گئی تھی۔ ایک بار اُس نے جان بوجھ کر اسے اپنے ہاتھوں سے چُھوا تاکہ وہ اسے قریب سے محسوس کر سکے لیکن وہ اپنی اس خواہش کی کپکپاہٹ اور تڑپ سے خود ہی جل اٹھی۔ ایک سے زیادہ بار اُس نے اس کے سینے کے پٹھے پر ہاتھپھیرا

اور اُس کے دل کی دھڑکن کو محسوس کیا جس نے اُس کی خاموشی کو بے نقاب کر دیا اور چپکے سےاسے بتایا کہ "میں تم سے محبت کرتا ہوں"۔

بعد میں، اُس نے اپنے آپ سے یہ عہد کیا کہ وہ اُس کے مزید قریب نہیں جائے گی ورنہ وہ اُس کے جسم کے جلتے ہوئےانگارے سے جل کر خاکستر ہوجائے گی۔ وہ ہر صبح صرف اس کے قریب ترین مقام پرکھڑے ہونے پرہی مطمئن ہو گئی، اورکوشش کرتی کہ اُس کو اپنے دیگر کارکنوں کے ساتھ کم سے کم وقت میں وہاں سے گزرنے کی سہولت فراہم کرے۔ اُس کو انتظار اور پریشانی کی کیفیت سے نکالنے پر اسے اندرونی خوشی کا احساس ہوتا جس سے اس کے ضمیر کو طمانیت ملتی جیسے موسیقی کی تالیں بیلے کے ساتھ ملتی ہیں۔

وہ خاموشی سے اُس سے بغیر کوئی لفظ بولے سرگوشی کرنے کو کہہ رہی تھی، اور وہ خواب میں بھی نہیں سوچ سکتی تھی کہ وہ اسے کسی فلسطینی شاعر کا شعری مجموعہ دے گا۔ اُس نے اسے یہ بھی بتایا کہ اُس کا نام محمود درویش ہے، اور وہ اُس سے بے حد پیار کرتا ہے۔

اُس کے لیے اس لمحے ضروری تھا کہ وہ اپنے خوبصورت عاشق کے لیے اس کے دیے ہوئےمجموعے کو دیکھے۔جیسے وہ اپنی انگلیوں کو چھوتے ہوئے ہر اُس صفحے سے لطف اندوز ہونا چاہتی ہو جسے اُس کے محبوب نے چھو لیا ہو۔ اُس نے مجموعے کھولا جس کے پہلے صفحہ پر خوبصورتی سے خمیدہ عربی ہینڈ رائٹنگ میں لکھا تھا ''جب میں تمہیں دیکھتی ہوں تو میری روح کے آسمان پر بارش برستی ہے اے مصلح الوادی!''

اُس نے اِس فقرے کو درجنوں بار پڑھا یہاں تک کہ اس میں موجود ہر ایک حرف کو یاد کر لیا، اور جب بھی وہ اس نفرت انگیز دیوار کے دروازے پر ملتےجس کا سایہ جھک جاتا،اور وہ اپنے دل کی بارش کو اُس کے چہرے کی دھوپ کے ساتھ جوڑنا پسند کرتی۔ اُس آدمی کے سینے پر وہ خود کو تسلیم کروانے سے ڈرتی تھی کہ وہ اُس سے پیار کرتی ہے۔

کئی مہینے گزر گئے جب وہ اس دروازے پر اس کے ساتھ محبت کا رقص کرتی رہی، بارش کے وقت بند

دھوپ والے دن کا خواب دیکھتی، اپنے ہاتھ سے اس دیوار کو اس کے تمام دروازوں کے ساتھ چھوتی اور اسے بلا خوف و خطر اپنے پاس جانے کی اجازت دیتی۔ کسی بھی خوف،اور شک کے بغیر میں یہ اعتراف کرتا ہوں کہ "مجھےتم سے بے حدپیار ہے "

آج صبحجب وہ اپنی نیند سے بیدار ہوئی تو وہ یہ جملہ بڑبڑارہی تھی کہ "میں بھی تم سے پیار کرتی ہوں" اور جب وہ فوجی گاڑی میں گیٹ کی طرف جا رہی تھی تو جیسے وہ کسی خواب سی کیفیت میں تھی اور دیکھ رہی تھی کہ اُس کی انگلیاں اس کے چہرے کو چھو رہی ہیں اوراُس کے ہونٹ اُس کے چھوٹے، روشن ماتھے پر بوسہ دیتے ہوئے گاڑی کی کھڑکیوں پر دستک دے رہے تھے اور سورج کی کرنوں نے جیسے بارش کی بوندوں کو چیلنج کر دیا تھا اور دروازے کے قریب آتے ہی وہ فاصلے کی سمت دیکھتی ہے کیونکہ جس سے وہ پیار کرتی ہے اُس سے صبح کی ملاقات کا وقت بھی قریب آرہا ہے۔

جب وہ گیٹ پر پہنچی تو وہ جگہ سپاہیوں کے شور اور اُن کے دھاڑتے ہوئے الفاظ سے گونج رہی تھی جویقینا کسی سنجیدہ مسئلے کی نشاندہی کر رہی تھی اور پیچھے سے فوجیوں کی لاشیں بھی زمین پر پڑی تھیں اور اُس کے ساتھی سپاہیوں نے اسے بتایا کہ تخریبی فلسطینی کارکنان نے ان پر حملہ کیا تھا۔ جیسا کہ وہ 'تخریبی' لفظ کے معنی کو اچھی طرح سےسمجھتی تھیجواصل میں اُن کے فوجیوں کو معصوم فلسطینیوں کو قتل کرنے اور اُن کے ساتھ بدسلوکی کرنے کے لیے ایک بہانہ مہیا کرتا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر اُس کے اندر سنسناہٹ دوڑ گئی اور اُس نے اپنے دل اور ہڈیوں میں چھائی ہوئی جھلسا دینے والی ٹھنڈ کو محسوس کیا۔ اُس کا محبوب وہاں خون اور جھاگ سے ڈھکا ہوا تھاا اور اُس کے چہرے پر جیسے ایک طنزیہ سی مسکراہٹ تھی۔اس لمحے میں وہ اُس کی گود میں اپناسر دفن کرنے کی ہمت کیے بغیر اُس کے اوپر جھک گئی۔ اُس کی زندگی اس وقت جدائی کی دیوار کے سائے میں ڈوبی ہوئی تھی جہاں صرف سڑاند، اندھیرا، افسردگی اور ناانصافی تھی۔ اس وقت ہنگری

واپس لوٹنا ہی وہ واحد خیال تھا جو اُسے اس وقت اپنے اندر محسوس ہو رہاتھا کیونکہ وہ وہاں کبھی بھی لوٹ کے نہ آنا چاہے گی جہاں اُس شخص کو ناحق مارا گیا تھا جس سے وہ بے حد پیار کرتی تھی۔

(6)
آخری شمع کس نے بجھا دی؟!

وہ زیادہ تر فلسطینی کارکنوں کی طرح سیاسی یا فلسفیانہ نظریہ سازی میں اچھی نہیں تھی کیونکہ وہ بھی پچھلی صدی میں پیدا ہوئی تھی، اور اُسے کتابوں کی دنیا میں جانے کا موقع بھی نہیں ملا تھا کیونکہ اس وقت کے سخت سماجی اصولوں کے مطابق، لڑکیوں کے لیے یہ منع تھا۔ اور پھر اُس کی اِبتدائی ازدواجی زندگی اور بار بار زچگی کے عمل نے اسے ثقافتی پروگراموں کی پیروی کرنے، لکھنا پڑھنا سیکھنے، یا خود کو سیاسی مکالمے کے سیشنوں کے لیے وقف کر دیا، لیکن وہ یہ بھی جانتی ہینکہ بہادری، الوطنی اور صہیونی دشمن کے خلاف فلسطینی مزاحمت حالات، اعداد و شمار اور صلاحیتوں پر مبنی ہے۔

اُس کی سب سے بڑی ملکہ کی نمائندگی اُس کی زچگی سے شروع ہوتی ہے جو کرہ ارض کی پوری آبادی تک پھیلی ہوئی ہے، اور صہیونی جیلوں میں فلسطینی قیدیوں کو گلے لگانے کے لیے اُس کی کہانی اس وقت شروع

ہوئی جب اس کے بڑے بیٹے، عبدالمجید کو جیل میں ڈال دیا گیا تھا۔ صہیونی جیل میں اسے عمر قید کی سزا سنائی گئی تھی اورپھر اس کے دو چھوٹے بھائی بھی اُس کی راہ پہ چلتے ہوئے اس سفاک جیل کے قیدی بن گئے تھے۔ اپنے بیٹوں سے ملاقات کے لیے وزٹ پرمٹ حاصل کرنے کے لیے اُس نے ذمہ دار حکام اور ریڈ کراس کا تعاقب کیا۔ ایسا شاذ و نادر ہی ممکن ہو پاتا کہ اسے بار بار انکار، تاخیر، دھونس اور انتہائی معمولی وجوہات کی بناء پر وزٹ پرمٹ حاصل ہو جاتااور پھر اس کے لیے اپنے بڑے بیٹے، عبدالمجید سے ملنے کا اجازت نامہ حاصل کرنا تقریبا ناممکن ہو گیا تھا۔ سزاؤں کو بڑھا دیا گیا اور اسے ہمیشہ کے لیے قید تنہائی میں رکھا گیا اور پھر وہ اپنے دو چھوٹے بیٹوں سے ملنے سے بھی محروم ہو گئی کیونکہ اُس کے اور ان قیدیوں کے درمیان قریب ہونے کے باوجود فاصلہ بہت بڑھ گیا تھا۔ ایسا دیوار جدائی کے سبب ہوا تھا جس کی وجہ سے فلسطین میں سوائے دیوار کے اندرونی اور بیرونی منطق کے اُن کی دنیا ناقابل فہم ہوگئی تھی----

اس غیر منصفانہ منطق والی ایک مضبوط کنکریٹ کی دیوار نے اسے اپنے زیر حراست بچوں سے الگ کر دیا تھا جیسا کہ یہ دیوار ہی ہزاروں فلسطینی ماؤں کو ان کے بیٹوں اور بیٹیوں سے الگ کرتی ہے۔ اس لیے اُس نے بھی اپنے فلسطینی نظربندوں کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کیا اور وہ دیوار کے خلاف اپنی مادریت کا استعمال کرنے کے لئے پرعزم تھی پھر یہ تجربہ اس کی زندگی کی ایک زندہ حقیقت بن گیا۔لیکن اُس کی بنیادی پریشانی کی وجہ ان نظربندوں سے ملنے کے لیے اجازت طلب کرنا تھی۔ ایک ایک کرکے، اُن کو جاننا، اور ان سب کی ماں بننا ان کی ماؤں کی جگہ جو ملاقاتوں سے محروم ہیں اور جو اُن تک آسانی سے نہیں پہنچ سکتیں۔

ریڈ کراس نے اس کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے اُس کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا، اور ثالثی اور مدد کی غرض سےاپنی محدود صلاحیتوں کو متحرک کیا تاکہ اُس کی ایک ایک کر کے تمام قیدیوں سے ملاقات کو یقینی بنایا جا جا سکے۔ اس بظاہر پیچیدہ ترین مرحلے میں اُس کی اندر کی ممتا اُس کی معاون تھی اور اس طرح سے وہ

بہت سے قیدیوں کی زندگی میں واحد شمع اور اُمید کی کرن تھی۔ مالاقات کے دوران، وہ ایک ایک قیدی سے اُس کے حالات پوچھتی اور اس کے مسائل کی پیروی کرتی اس طرح کہ وہ بغیر کسی شکایت اور بیزاریت کے ان کی شکایات سنتی اور ایک حقیقی ماں کی طرح اُن کے درد اور ظلم کو دور کرنے کی پوری کوشش کرتی رہی۔ اُس کا اس طرح کی ملاقات کادورہ ہر قیدی کے لئے ایک بام بن گیا، لہذا وہ جیل کے اندھیروں میں اُن نظربندوں کی باغی روحوں کو تھامے ہوئے ان کی آخری اور واحد شمع بن گئی، اور اس نے مستحق طور پر "قیدیوں کی ماں" کا خطاب حاصل کیا۔

وہ اس زبردست ممتا کی تڑپ کے ساتھ اپنے بچوں کو قید سے آزاد کرنے اور انہیں اپنےرب کے مقدس گھر میں حج کی سہولت فراہم کرنے کے لئےاللہسے شفاعت کر رہی تھی۔ اِس سے پہلے کہ رب تعالیٰ اُس کی وفادار روح کو بحال کرتے ہوئے اسے اپنی طرف سے منتخب کرتا جہاں غیر متوقع طور پر رحم اور انصاف تھا، اُس کا سب سے بڑا بیٹا جیل سے رہا ہو کر باہر آگیا۔ اسے

صیہونیوں کے ساتھ قیدیوں کے تبادلے کے معاہدے کے تحت بیروت میں جِلاوطن کر دیا گیا تھا۔ وہ ہمیشہ اپنی والدہ اور والد کو مقدس گھر کا حج کروانے کی خواہش رکھتا اور اس کے لیے مناسب مواقع کی تلاش میں رہتا تھا۔ اُس کی محنت اور مسلسل کوششیں بالآخر رنگ لے آئیں اور اُنھیں ایک سفری ویزا، حج والی بس میں دو مخصوص نشستیں، اور ذادِراہ کے لیے مناسب رقم مل گئی۔ یہ سب چیزیں اُس نے اپنی جلاوطنی کے دوران اپنے والدین کے لیے بھجوائیں تھیں۔

"قیدیوں کی ماں" بے حدخوش تھیں کہ اُن کا حج کا خواب پورا ہونے جا رہا تھا اور خاص طور پر ان کے دو بیٹوں کی جیل سے رہائی کا وقت قریب آنے کے ساتھ ہی اُنہوں نے اپنے شوہر کے ساتھ رب تعالیٰ کے مقدس گھر جانے کی تیاری شروع کی۔ اِس مقدس سفر پر روانگی سے قبل، انہوں نے تمام نظربندوں کو الوداع کرنے کا عزم کیا اور کئی ہفتوں تک اُن کے محبت بھرے پیغامات ، اور دعاؤں کو سنا جو وہ اپنے اہل خانہ تک

زبانی پیغامات کے زریعے بھجوانا چاہتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کی ان کے پیارے انہیں آکر مل جائیں ۔

جب وہ دیوار کے دروازے سے نکل کر رب تعالیٰ کے مقدس گھر کی طرف بڑھی تو اسے ایک بات یاد آئی۔وہ اصل میں وہ زبانی پیغامات تھے جو قیدیوں نے اُسے روانگی سے قبل دیے تھے۔ دیوار کی تنہائی؛ شاید یہ بھی آخری بار ہو گا اس سے پہلے کہ وہ اس جگہ کو چھوڑے۔

وہ کافی دیر تک بغیر کسی پابندی کے افق تک پھیلے ہوئے آسمان کی طرف دیکھتی رہی اور اپنے سامنے فلسطینی قیدیوں کی ماؤں کے دِلوں کو دیکھا جو اپنے زیر حراست بچوں کی خبروں کے لیے ترس رہی تھیں۔ان لمحات میں اُس کا دماغ ہزاروں زبانی پیغامات سے بھرا ہوا تھا اور تب ہی اُس نے اپنے ساتھیوں کی آوازوں، اُن کے جذبات اور اپنے محلے کی الجھنوں اور پریشانیوں کو دیکھتے ہوئے قربانی دینے کا فیصلہ کیا ۔ وہ فیصلہ یہ تھاکہ وہ حج پر نہیں جائیں گے، ، بلکہ اپنی آزادی

حاصل کرنے کے لیےدیوارِ جدائی کے باہر سرمایہ کاری کریں گے۔

اُس کے لیے رب تعالیٰ کے مقدس گھر کی زیارت کے اپنے خواب کو حاصل کرنے کے لیے اپنے آپ کو روکنا اتنا مشکل نہیں رہا ۔اُس نےاپنے اندر رحم اور ممتا کی آواز کے ساتھ اپنے حج پرجاتے ہوئے شوہر کو الوداع کہا اور اس وقت وہ سفید لباس میں تھی، اُس نے اپنا ہاتھ ہلایا اور اُس کے اور اپنے لیے مغفرت کی دعا کی۔ ا

"قیدیوں کی ماں" نے اپنے وطن کی سرزمین پر لگاتار گھومتے ہوئے اور لوگوں کے دروازے کھٹکھٹاتے ہوئے لامتناہی دن گزارے کیونکہ جب تک کہ اُس نے خطوط ان کے مالکان تک نہ پہنچائے، اُس نے کسی بھی ماں کو تسلی دیے بغیراور کسی بھی بیوی کو رازداری کے بغیر نہیں چھوڑا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ کوئی بھی بچہ اپنے نظر نہ آنے والےوالد کے بوسے کو محسوس کیے بنا نہ رہ سکے اور اپنے والد کے تصور کو خود میں زندہ رکھے جسے اُس نے طویل عرصے سے نہیں دیکھا تھا۔

تمام نظر بند قیدیوں کے امانت کے طور پر دیے گئے خطوط اُن کے گھر والوں تک پہنچانے کے بعد وہ بے حد پُرسکون تھیاور اب اُس کے گھر واپس لوٹنے کا وقت آ گیا تھا۔ اُس نے اپنی تھکاوٹ اور قیدی بچوں کی تڑپ کو یکجا کیا، اور داخلی دروازے کو عبور کرنے کے لیے لمبی قطار میں کھڑی ہو گئی۔ علیحدگی کی دیوار کے ذریعے دوسری طرف جانے میں اُس کا انتظار کافی طویل ثابت ہو رہا تھا، جیسا کہ وہ (دیوارِ جدائی) ان کی تذلیل کرتی رہی اور ان کو ہراساں کرتی رہی۔ اِس لیے وہ اپنی اسی سالہ عمر کی پریشانیوں سے بوجھل ہو کر ایک قریبی جگہ پر چلی گئی۔ کسی مظلوم قیدی کی طرح کافی دیر تک اُس کا جسم وہاں پڑا رہا لیکن اُس کی روح ایک خالص سفید پرندہ کی طرح تھی جو حج کے بعد جدائی کی دیوار کے بھوت سے دُور اپنے رب کی طرف آخری آرام گاہ میں پرواز کر رہی تھی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کی جیسے وہ اپنے رب سے ملنے کے لیے تیار ہے جو نہایت مہربان، رحیم اوراپنے بندوں پر شفقت کرنے والا ہے۔

(7)
جب چھٹی نہ ملے

وہ بڑی مشکل سے الفاظ کا تلفظ اداکرتا ہے جیسے ہوا سے بھرے ہوئے حروف کے اخراج اور منہ سے نکلنے والی جھنجھلاہٹ جسے وہ زور سے نچوڑ کر اس سے لفظ "ہاہا" نکالتا ہے، تو بلاشبہ وہ اُس کے نام کا تلفظ اداکر رہا ہے۔ اُس کا بیٹا ہادی!

اُس نے اپنی آستین کو چیلنج کرنے کی کوشش کرنے کا کبھی نہیں سوچا تھا، جو کہ اُسے ایک زبردست بم دھماکے کے نتیجے میں صہیونی تحفہ کے طور پر ملا تھا اور جس کی وجہ سے وہ شیر خوار بچہ اپنی سماعت سے محروم ہو گیا تھا۔

اُس نے ایک دن میں ایک لفظ بھی کہنے کی کوشش نہیں کی، اور اُس نے اپنی ضروری ضرورتوں، جیسے کہ کھانے، پینے، آرام کرنے، سونے یا آرام کرنے کی ضرورت کو سمجھانے کے لیے جو اشارے سیکھے تھے وہ اُن سے ہی مطمئن تھا۔

وہ کبھی بھی گونگے اور بہرے لوگوں کے بنے ہوئے اِداروں سے تربیت نہ حاصل کر سکا کیونکہ ایک تو یہ تمام اِدارے اُس کے گاؤں سے کافی دُور تھے اور دوسرا جگہ جگہ صہیونی چوکیوں کی موجودگی کی وجہ سے بھی وہاں جانا تقریبا ناممکن تھا۔ لیکن جب سے آسمان اُس کے لیے وسیع ہوا تو اُس کا دل بھی اپنے بیٹے ہادی کے ساتھ خوش ہوا کیونکہ ہادی اپنے کزن تمم کے ساتھ بے حد خوش دکھائی دے رہا تھااور اب اُس کے پاس دن رات اس کا نام لینے کی ایک مقدس وجہ ہے۔ اگر چہلفظ ہا ہا ککا تلفظ بڑی مشکل سے اور بار بار دہرائے جانے کی صورت میں نکلتا ہے، لیکن اُسے اس بات کی خوشی ہے کہ اُس کا بیٹا ہادی یہ بات جانتا ہے کہ وہ اُسے پکار رہا ہے۔اُس کے الفاظ، اور اُس کی یہ ننھی ننھی سی کوششیں اُس کے لیے اس کی پوری زندگی میں کافی ہیں ، کیونکہ اُس کے پاس اپنے بیٹے ہادی کے علاوہ کوئی اورزندگی نہیں ہے۔

چونکہ ہادی کی پیدائش نو سال پہلے ہوئی تھیاوراُس کے پاس زندہ رہنے کا ایک واضح مقصد تھا اور اس کے

لیے اُس نے اپنے گاؤں میں صہیونی قبضے کا مقابلہ کرنے کے لیے مسلح بریگیڈز میں شمولیت اختیار کی تھی، اور ایک کے بعد ایک دردناک وار کے زریعے صیہونیوں کو کافی نقصان پہنچایا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ صیہونیوں کو اُن کے جرائم اور بدسلوکی کی سزا ضرور ملنی چاہیے اور انہیں اپنا کھویا ہوا وطن اُن سے آزاد کروانے پہ زور دینا چاہیے۔ کیونکہ یہ ملک اُس کے بیٹے ہادی اور فلسطینیوں کے تمام بچوں کا ہے نہ کہ صیہونیوں کی اولادوں کا۔فلسطینیوں کو یہیں پہ پروان چڑھنا چاہیے، یہیں خوش ہونا چاہیے، اور مرنے کے بعد یہیں دفن ہونا چاہیے، اورجہاں تک اجنبیوں کی بات ہے تو اُن کے لیے اِس سرزمین میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ اِس لیے اُسے اپنی زندگی، اپنی جدوجہد اور اپنی قیمتی چیزوں کی قربانی دینے سے گریز نہیں کرنا چاہیے۔ اُس کی زندگی کا واحد مقصد اپنے بیٹے ہادی کو صہیونی قبضے کے بغیر ایک آزاد اور منصفانہ مستقبل دینا تھا۔

پہلے تو فلسطینی مسلح بریگیڈ ایک ایسے بہرے آدمی کو بھرتی کرنے کے خیال کے بارے میں پرجوش نہیں تھے

جو اُن کے اندازے کے مطابق بات چیت کرنے سے تقریباً نا اہل تھا، لیکن جب اُنہوں نے اُسے متعدد امتحانات سے دوچار کیا تو انہوں نے اسے ہمت کی ایک مثال پایا۔استقامت، محنت، ایثار اور تدبر سمیت وہ ہر کام کو پوری رازداری، خلوص اور لگن کے ساتھ سر انجام دیتا ہے۔ رات کے وقت، ہادی بیٹا سوتے وقت جب اپنے باپ کے دائیں کان میں سرگوشی کرتا تھا تو وہ اُس کی نورانی پیشانی پر ایک لمبا بوسہ دیتا تھا، اور پوری شفقت اور فخر کے ساتھ اسے اپنے سینے سے لگا کر سوتا تھا۔ اس گہری پُر سکون نیند میں وہ آنے والے خوشگوار وقت کے خواب دیکھا کرتا تھا؛ ایک آزاد اور خود مختار فلسطینی ریاست کا خواب!!!!۔

کل مبارک عید الاضحی کا دن ہے، اورایک باپ ہونے ناطے اُس کی دِلی تمنا ہے ہے کہ وہ اِس آنے والی عید پراپنے بیٹے ہادی کا ہنستامسکراتا ہوا، خوش، تندرست اور ہر بیماری یا پریشانی سے شفا یاب چہرہ دیکھے اور اُس کی بیوی (ہادی کی ماں) اُسے پھولوں کے گلدستے کی طرح اٹھائے اور گاؤں کے گھروں میں اُن کو عید کی

مبارکباد دیتے ہوئے انہیں حالات کے بہتر ہونے کا یقین دلائے اور غریبوں کے گھروں تک مٹھائیاں پہنچائے اور اُن کے ساتھ تمام حالات پر شفقت اور ہمدردی کا اظہار کرے۔ اُس کی اہلیہ نے وسائل کی کمی کی وجہ سے برسوں سے عید کے نئے کپڑے نہیں پہنے تھے، خاص طور پر اس علیحدگی کی دیوار کے لگنے کے بعد، جس نے فلسطینیوں کے یہاں اور وہاں سے محنت سے کمائے گئے روزگار کے زیادہ مواقع کو نگل لیا تھا۔ ہادی کو ہر عید پر اپنے نئے کپڑوں پر فخر ہوتا تھا، چاہے اُن کپڑوں کے حصول کے لیے گھر کا فرنیچر ہی کیوں نہ بیچنا پڑے، یا لمبے دنوں تک گوشت کھانا ہی چھوڑ دیا جائے۔ تب بھی یہی پیارا پہادی ہوتا تھا جو بہت خوش رہتا تھا چاہے اُس کی اور اُس کی بیوی کی آنکھیں ان لمحوں میں رو رہی ہوتی تھیں۔تو کیا ہادی اس نئی آنے والی عید پہ اپنے نئے کپڑوں سے خوش نہیں تھا؟

پچھلی چھٹیوں میں، وہ اپنے اور اپنی والدہ کے ساتھ گاؤں کے ایک بڑے عوامی چوک پر گاؤں والوں کے ساتھ چھٹی منانے کے لیے گیا تھا، لیکن چونکہ دِیوارجدائی

نے انھیں چوک سے اور ان کے گاؤں کی زیادہ تر زمینوں اور گھروں سے الگ کر دیا تھا، اس لیے وہ اب کی بار پُرسکون سا تھا۔ وہ گھر کے پچھواڑے میں لگے ہوئے اکلوتے جھُولے پر کھیلتا رہتاہے اور وہاں اپنے بہت سے پڑوسیوں کے ساتھ لطف اندوز ہوتا ہے۔ یہاں کے لوگوں کے پاکیزہ دل چھوٹی سے چھوٹی وجہ سے بھی خوشی پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور یہی چیز اُن میں زندگی کی اُمنگ اور اُمید پیدا کرتی ہے۔ یہ لکڑی کا ایک چھوٹا سا جُھولہ ہے جوکہ ایک پرانے شہتوت کے درخت کی شاخوں پر پھیری ہوئی رسیوں کے ساتھ لگا ہوا ہے۔

جہاں تک اُس کی خوشی کا تعلق ہے تو وہ ہادی کی زات سے وابستہ ہے اور اُسے کو اپنے دوستوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے اپنی روح کی پوری حد تک مسکراتا دیکھ کے محسوس ہوتی ہے۔ جب وہ اپنے چمکدار، خوشگوار اورنئے کپڑوں میں گھومتا ہے تو وہ مور کے جیسے تکبر کے ساتھ عید کا استقبال کرتا ہے۔ گھر کی پچھلی کھڑکی سے جو جھُولے والے لان میں کھلتی ہےوہ اُس

کو مسلسل دیکھتا ہےاور بے تکان دیکھتا رہتا ہے۔ اُس کی روح کی پیاس اپنے پیارے بیٹے ہادی کو دیکھ کر ہی بھرتی تھی اور وہ اُس کی حرکات و سکنات کو بلا تکان محسوس کرنا اُس کا من پسند مشغلہ تھا۔

مسجد میں اُس نے بڑے دھماکے کی آواز نہیں سنی تھی جیسے کہ اُس کے ساتھ موجود باقی نمازیوں نے سنی تھی کیوں کہ وہ بہرا ہے، لیکن اسے اچانک سےایک اَن دیکھا سا خوف محسوس ہوا جس کا وہ پہلے کبھی بھی عادی نہیں تھا۔ اُسے مسجد کے باہر دوڑتے ہوئے نمازیوں کی وجہ سے معلوم ہوا تھاکہ اُس جگہ پر کچھ برا ہوا ہے، اور وہ اُن کے ساتھ اُسی سمت بھاگ رہا تھا۔ اپنے اکلوتے بیٹے ہادی کی طرف سے اُس کی صرف یہی خواہش تھی کہ وہ جلد از جلد اُس تک پہنچ جائے اور وہاُسے اپنے سینے سے لگائے اور بغیر رکے اس کی تازہ خوشبو کو محسوس کرے لیکن اس مقام پر پہنچتے ہی جو کچھ دیکھا اُس نے اسے بے حد خوف میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہاں کی زمین مکمل طور پرخون کے سمندر میں ڈوب رہی تھی لیکن اُن لہو میں لتھڑے ہوئے

چہروں میں اُسے ہادی کا چہرہ دکھائی نہ دیا تھا۔ صہیونی جبر سے پناہ مانگتے ہوئے اُس نے آسمان سے مدد طلب کی کہ عید کی صبح بچوں کو کھیلتے ہوئے دیکھنے کی جوخوشی تھی اسے اِس دردناک منظر نے پلک جھپکتے ہی بدل دیا تھااور نادانستہ دل جسم کے اعضاء اور خون کے ملبے میں تبدیل ہو گئے تھے۔

بکھری ہوئی باقیات کے درمیان ہادی کو ڈھونڈنے میں اُسے زیادہ دیر نہیں لگی تھی اور اُس نے اس کا جلتا ہوا مُردہ سر جُھولے کے پاس دیکھا اوراس وقت وہ اپنی نیلی آنکھوں سے پہچانا نہیں جا سکتا تھا جو اُسے اپنے نانا حاجی عبداللطیف سے وراثت میں ملی تھی۔ اُس کے سوا محلے میں کوئی بچہ نہیں تھا،اور اُس نے اپنے اکلوتے بیٹے ہادی کا سر اپنے سینے سے لگا لیا تھا کیونکہ اب وہ بہت دور چلا گیا تھا حالانکہ وہ خون، موت اور تباہی سے ڈرتا تھا۔

اُس دردناک رات میں وہ نہ رویا تھا اور نہ ہی اُس نےہادی کی موت کا ماتم کیا تھا۔ خواہ وہ سر کے ساتھ یا اس کے بغیر پڑا ہوا تھا اُسے اسی طرح اپنے باپ کی

روح میں زندہ رہنا چاہیے تھا جب تک کہ اُس کا وطن آزاد نہ ہو جائے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ اُس کے لیے ہادی کی مسکراہٹ کے بغیر جدوجہد، سرزمین یا وطن کی کیا ضرورت ہے؟ ہر صبح اٹھنے کا بہانہ؟۔

آج کی رات، اُس کے پاس ایک فوجی مشن ہے جو اسے اُس کے گروپ نے سونپا ہے، جس میں علیحدگی کی دیوار کے باہر سے گاؤں میں ہتھیار اور خوراک کی اسمگلنگ شامل ہے جس نے انہیں کھانے کے ایک لقمے سے بھی محروم کر دیا، اور یہاں تک کہ اُن کا محاصرہ کر لیا۔

وہ اِس مشن کو کسی بھی قیمت پر ملتوی نہیں کرے گا کیونکہ ایک ہزار یا اس سے زیادہ ہادی دیہات میں بھوکے ہیں، اور اسے انہیں کھانا فراہم کرنا ہوگا، اور ہادی اس بات کو قبول نہیں کرے گا کہدوسرے بہت سے بچے اُس کی خوبصورت، نیلی آنکھوں کے قتل کے سوگ میں بھوکے رہیں۔ اِس لیے اُسے اپنے مشن کو پورے عزم اور خلوص کے ساتھ گروپ میں اپنے ساتھیوں کے احتجاج کے باوجود انجام دینا چاہیے۔

وہ اپنے مشن کو کمال کے ساتھ سرانجام دیتا ہے، اور ہتھیار اور کھانا ایک مشکل سفر کے بعد گاؤں میں داخل ہوتا ہے تاکہ جدائی کی دیوار سے الگ کی گئی سرحدوں کو پار کر کےتمام ساتھی اپنے پیاروں کے ساتھ اِس جگہ سے نکل جائیں تاکہ انہیں ان لوگوں میں تقسیم کیا جا سکے۔ اگلی صبح وہ ان قاتل بدمعاشوں کے ساتھ اپنا سکور طے کرنے کے لیے دوبارہ دِیوار کی طرف لوٹتا ہے جنہوں نے اس کے بیٹے ہادی کو قتل کیا تھا۔ اُس کے پاس اِس وقت صرف دو بم، ایک چھوٹی پورٹیبل توپ، اور اس کی کمر کے گِرد ایک ہولسٹر ہے جس میں ہادی کا خون جما ہوا ہےاور اُس کے دھندلے بالوں والا وہ سر، جو اُسے ایک جادوئی طاقت دیتا ہے اور جو اسے اِس دیوار کو اپنے گھناؤنے ناخنوں سے اکھاڑ پھینکنے کی ہمت دیتاہے۔ وہ دو بموں کو ناکارہ بناتا ہے، اور اس جگہ کواُن ظالم لوگوں کی پکار کی آوازوں سے بھرا ہوا ایک سرخ جہنم بنا دیتا ہے۔ مدد کے لیے چیختے اورمرتے ہوئے صہیونی فوجیوں کے درمیان، درجنوں سمتوں سے اُس پر گولیوں کی بارش ہو رہی تھی۔ اُس کا ہاتھ اپنی

مشین گن کے ٹرگر پر تھا اور وہ اپنےقریب آنے والے کسی بھی فوجی کو بے دردی سے مارتا جا رہا تھا، اور ہادی کا سر اپنے باپ کی ہمت پر بے حد مسرور تھا۔

جب صبح ہوتی ہےتو قتل عام درجنوں مردہ لوگوں کی لاشوں پر، اور فلسطینی کپڑوں میں ایک شخص کی لاش پر اور ایک چھوٹے سے جلے ہوئے سر پر درجنوں قابض صہیونی بکتر بند گاڑیوں نے اس جگہ کو گھیرے میں لے لیا تھا۔ لاش کے پتے، سپاہیوں اور کتوں سے گھرے ہوئے، سپاہیوں کے درد پر خوش ہوتے ہوئے، اُسے الوداع کہتے ہیں، جب کہ ہادی کا جلتا ہوا سر اُس کی طرف لے جایا جاتا ہے جو اس کا انتظار کر رہا ہے۔ جب تک وہ اپنے پیارے باپ کی قسمت کا سامنا کرتا ہے اُس کی پرواہ نہیں کرتا۔

شام کو اسمگل شدہ کھانا گاؤں کے تمام گھروں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے جب تک کہ وہ سیر نہ ہو جائیں اور ہادی اپنے گاؤں کے بچوں کو کھاتا دیکھ کرجی بھر کے سیر ہو جاتا ہے۔ یہ بات کوئی بھی نہیں جانتا کہ گاؤں کے بچوں کے لیے کھانا اُن کے گھروں تک کیسے پہنچتا

ہے، لیکن وہ اُس "آدمی" کی کہانی پر یقین رکھتے ہیں، "بہرا ہی کھانا پہنچانے والا ہے" اور وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ آگے ایک بہادر بھوت رہتا ہے جو اپنے جلے ہوئے سر سے سپاہیوں اور محافظوں کو خوفزدہ کرتا ہے اور وہ تمام سامان لے کر آتا ہے جو وہ چاہتا ہے، اور کوئی بھی اسے روکنے کی ہمت نہیں کرتا، کہتا ہے۔ "ہا---"

(8)
چیخوں سے بھری ہوئی وادی

کئی سالوں تک اِس جگہ کا نام وادی الرّمان تھا لیکن جب سے جدائی کی دیوار آئی تھی تو وادی کی زمینوں کو بلڈوز کر دیا گیا تھا اور یہاں کے درختوں کو اکھاڑ پھینکا گیا اور اسے ویران اور اس کے تختوں سے خالی کر دیا گیا تھا۔اُس وقت سے یہ ایک الگ کرنے والی زمین بن کر رہ گئی تھی۔ قصبے کے دونوں کنارے جو کہ ایک قصبہ ہونے کے بعداب دو چھوٹے چھوٹےقصبوں میں تبدیل ہو گئے ہیں جس کی اپنی ایک طویل تاریخ ہے۔ بلبلوں نے انار کے درختوں کے کھیتوں میں اپنے سرسبز گھونسلوں کو کھو کر وادی کو چھوڑ دیا اور وادی اپنے ان خوبصورت مکینوں کے بغیر اداس ہو گئی تھی۔اب اِس وادی کا افسوسناک نام "چیخنے کی وادی" پڑ گیا تھا کیونکہ اب یہ جدائی کی دیوار کے اس پار رونے والی آوازوں کے لیے کھیل کا میدان بن گئی تھی۔

فلسطینیوں نے اسے "چیخنے کی وادی" کا نام دیا تھا کیوں کہ وہ اپنی ہی سرزمین پر کسی بھی چیز کے بارے

میں بات کرنے کے لئے چیختے ہیں اور اُن کی زبان، چہرے، کھال، دل، اعضا ء ہر وقت چیخ و پکار اور آہ وبکاہ کرتے رہتے ہیں۔ اس وادی میں التجائیں، حمدیں، ترانے، خبریں، لطیفے، دعائیں اور قرآنی آیات بھی سنائی دیتی ہیں جن کا ہاتھ تھامنے کےوہ اپنے انسانی حق سے بھی محروم ہیں۔ ہاتھ سے، دل سے، آنکھ سے آنکھ تک، اور کوئی بھی انسانی گفتگو، چاہے وہ کتنی ہی محدود اور مختصر ہو، اس کےلیے اب چیخنا ہی اُن کا آخری حق بن گیا ہے۔

وادی مینیقینا آپ نے ایک ماں کو اپنی بیٹی سے بات کرتے ہوئے سنا ہو گا جو دیوار سے بچھڑ گئی تھی، اور ایک بوڑھی عورت جو برسوں کی سختیوں اور تکالیف میں گھری ہوئی اپنے بیٹے کو اپنے گھر واپس آنے کے لیے پکار رہی ہے، اور جو بھی سنُتا ہے اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں۔ ایک چھوٹی لڑکی کی آواز جو اپنے والد سے کہتی ہے کہ وہ اُسے اپنے گھر واپس لے جائے جب وہ اپنے کزن کے گھر کے دورے پر دیوار کے باہر پھنس گئی تھی، اور اس نے روتے ہوئے اپنے

باپ سے التجا کی کہ وہ اسے اپنے ساتھ لے جائے، اور اسے مایوس اور اکیلے واپس نہ کرے۔ ، اور اُس کا باپ مسلسل سسکتی ہوئی سسکیوں میں ڈوب گیا کیونکہ اُس میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ وہ اپنی معصوم بیٹی سے کوئی نیا وعدہ کر سکے جس کے ساتھ وہ صبر کرےکیونکہ وہ جانتا تھا کہ اِس وعدے کی تکمیل مشکل سے بہت دُور ہوگی۔۔ وادی کے سب سے دُور، خاردار تار کے قریب ترین مقام پراُس کا باپ لکڑی کی دو بیساکھیوں پر ٹیک لگا کر کھڑا تھاجو اُس کی بغلوں کے سوراخوں میں پھنسی ہوئی تھی، اور اُس نے اپنے گھر سے دِیوار جدائی تک پہنچنے میں ایک مشقت بھرے سفر کے بعد سیدھا کھڑا ہونے اور تھک کر نہ گرنے کی جدوجہد کی تھی۔ اُسے دو گھنٹے سے زیادہ کا وقت لگے گا، اور اگر دس منٹ میں یہ وقت گزر جائے تو وہ عزم اور ارادے کے ساتھ چل پڑے گا۔ بہرحال وہ کسی بھی طرح سے خود کو گھسیٹ کر یہاں تک پہنچنا چاہتا تھا اور چیختے ہوئے لوگوں کے ہجوم کے درمیان خود کو

داخل کرنا چاہتا تھا۔ وہ وادی کے دور دراز تک پیچھے ہٹ گیا تاکہ ہُودا کی طرف سے سفید کبوتر کو گھونستے ہوئے سنائی دینے والی چیخوں کے قریب ہو سکے جو دن رات موت کی سی گہرائیوں میں ڈوب رہا تھا۔ وہیں دھیشی کیمپ کے ریڈ کریسنٹ ہسپتال میں، جہاں وہ پہلی بار اس سے ملا تھا۔

ہُودا اُس سے گیارہ سال بڑی ہے، لیکن اُس کا پتلا جسم، چھوٹی کھوپڑی میں دھنسی ہوئی آنکھیں، اُس کے مٹھی بھر سبز بادام جیسے چھوٹے چھوٹے ہاتھ، اُس کی شرمیلی مسکراہٹ اور اونچے کالر والی اُس کی سفید وردی، اُس کی شخصیت کو کافی دلکش کے بنا دیتی ہے۔ کبھی کبھی وہ اُس سے چند سال چھوٹی نظر آتی ہے اور اگرچہ وہ کموڈیفائیڈ مارکیٹنگ کے معیار کے مطابق توخوبصورت نہیں ہے لیکن اُس کی سفیدجلد رنگت کے معیارات کے مطابق کافی حد تک دلکش ہے۔ خاص طور پر اُس کا خوبصورت اور خوش مزاج دل جوہر اُس شخص کی مدد کرنے کو تیار رہتا ہے جو اُس سے مدد

مانگتا ہے۔خاص طور پر اُن بیمار اور زخمی لوگوں کی مددجن کے ساتھ اسپتال بھرا ہوا ہے اور اِس لیے صالح اُسے ایک "سفید فلسطینی کبوتر" کے طور پر دیکھتا ہے۔ اُس کی خواہش تھی کہ ہُودا سے اُس کی ملاقات تب ہوتی جب وہ یروشلم کی یونیورسٹی میں تھا اور جہاں وہ ایک بہادر نوجوان تھا جو کسی خوف، کمزوری یا بزدلی کو نہیں جانتا تھا اور وہ اپنے بوڑھے والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کرنے میں سب سے آگے تھا۔ اسی طرح صیہونیوں کے ظلم کے خلاف مظاہروں کے دوران ، ایک صیہونی ڈسٹرائر کی رائفل نے اسے مستقل طور پر مفلوج کر دیا تھا اور اِسی وجہ سے اُس نے ہسپتال کے بستر پر طویل عرصہ گزارا۔ اُس کی ملاقات ہُودا سے تب ہوئی جب وہ اپنی سب سے کمزور حالت میں تھا، اور اُسےسب سے زیادہ ہمدردی، رحم اور مدد کی ضرورت تھی۔

اُسے اپنے گھر والوں کو یہ بتانے کی قطعی ضرورت نہیں تھی کہ وہ مستقل طور پر مفلوج ہو چکا ہے اور وہ اب کبھی بھی اپنے پیروں پر نہیں چل سکے گا۔اُس کی

صحت یابی کے لیے اُس کی ماں کی مسلسل دعاؤں کے باوجود، وہ جانتا تھا کہ وہ ہمیشہ کے لیے مفلوج رہے گا کیونکہصہیونی دشمن کی گولیوں نے کبھی کوئی دعا، بھیک یا رحم کی درخواست نہیں مانی تھی۔ نرس ہُودا کی اُس کی دیکھ بھال کرنا اُس پر رحم یا فرض کی نسبت سے نہیں تھا جیسا کہ اُس کے چچا ابو حسین، جو اس کے ساتھ کیمپ میں تھے، نے اصرار کیا تھا۔اُس کے دل میں محبت کی گھنٹیاں بج اُٹھیں اور اسے احساس ہوا کہ اُس کے دل میں ایک مقدس آگ جل رہی ہے بالکل اسی طرح جیسے بیس سال کے نوجوان کے دل میں جلتی ہوئی آگ ہے، جس نے اپنے کیمپ میں صرف خوشی کی ایک جھلک چکھی تھی۔ وہ اس وقت ایسے خواب دیکھ رہا تھا جو شاید پورے نہیں ہوتے۔

جب اُس نے اپنے گھر والوں کو ہُودا سے شادی کرنے کے ارادے کا بتایا تو وہ حیران رہ گئے تھے، پھر اُس کے دل کو یہ شکوہ کرنے پر مجبور کیا کہ آیا یہ پاک دامن نرس اس سے محبت کرے گی؟ اُس کی حالت یہ تھی کہ وہ اپنے پیشاب پر قابو نہیں پا رہا تھا اور کسی

بھی فطری رویے کو انجام دینے کے لیے صحت مندی کا ہونا ضروری تھا۔ لیکن اُس نے انہیں یقین دلایا کہ اُن کی محبت سماجی وضاحتوں اور حالات کے اعداد و شمار سے کہیں زیادہ ہے، اور محبت یہ نہیں جانتی کہ ناممکن یا رکاوٹ کیا ہے؟ اِس لیے وہ ہمیشہ اُس کے ساتھ رہے گا، اور اس نے اپنی زندگی کے آخری لمحے تک اس کے ساتھ رہنے کا صاف صاف اور واضح فیصلہ کیا،اور اُس کے دل کی فتح کے طور پر جنسی تعلقات یا افزائش کے اپنے حق کی قربانی دی۔

اُس کے گھر والوں نے اِس امید بھری محبت پر اس کے بھروسے کی نادانی پر افسوس کا اظہار کیا، اور اُسے اپنے طریقے سے ٹھیک کرنے کے لیے معاملے کو وقت کے سہارے پر چھوڑ دیا۔ اُس کا علاج اکثر تکلیف دہ اور کاسٹک ہوتا ہے، لیکن جب انھیں یقین ہوا کہ نرس ہُودا نے اس شادی کی منظوری دے دی ہے اور اُسے اپنی خوشی کا واحد ضامن سمجھا ہے تو انہوں نے اس شادی کو خاندان کی طرف سے جہیز جمع کرنے کے لیے چندہ کی مہم سے نوازا، جس میں انھوں نے اپنی پہلی مدد کے

لیے ایک ہزار ڈالر مشکل سے جمع کیے تھے۔ شادیسے متعلق معاملات تقریباً جلد ہی طے ہو گئے تھے جب صالح ہسپتال سے رخصت ہوا اور اپنی ماں کے ساتھ اپنے کمرے کی تیاری مکمل کرنے کے لیے اپنے گھر واپس آیا۔ وہ کمرا اُس کے لیے شادی کا انتظار کرنے والا ایک گھونسلہ ثابت ہو رہا تھا۔

جدائی کی دیوار راتوں رات آئی اور یوں وہ اپنے گھر میں اور اُس کی محبوبہ ہسپتال میں قید ہو کر رہ گئے۔ اِس طرح اُن کے درمیان جیسے دو زمینوں کا راستہ بن گیا اور محرومی اور جدائی کا ایک ایسا سماں پیدا ہوا کہ دونوں ایک دوسرے سے ملنے کو ترسنے لگے۔ اُس نے اپنی محبوبہ کو اپنے پاس لانے کی بے سود کوشش کی اور اِس کے لیے وہ ریڈ کراس کی مدد سے حاصل کردہ علاج کے اجازت ناموں کے ذریعے اُس کے پاس بھی جاتا ہے، لیکن وہ بار بار ناکام ہوتا رہتا ہے۔ اُسے احساس ہوا کہ وہ ہُودا سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو گیا ہے۔

اب اُس کے ساتھ بات چیت کرنے کا واحد راستہ اُداس وادی میں جا کر چیخنا تھا اور وہ وہاں ہر صبح آتی تھی،

اور وہ صبح سے ہی اپنے آپ کو اس وقت تک گھسیٹتا رہتا جب تک کہ وہ مقررہ وقت پر اُس کے پاس نہ پہنچ جائے، اور کانٹے دار دیوار کے پاس اپنی بیساکھیوں کے سہارے کھڑا نہ ہو جائے۔ پھر وہ بلند آواز میں پکارتا "ہُودا!میں تم سے محبت کرتا ہوں ... تم سے"۔

ہُودا اُسے دلیری سے جواب دیتی "اور میں تم سے زیادہ پیار کرتی ہوں، صالح۔"

صالح نے اُس سے اس جوشِ جزبات میں پوچھا جیسے کوئی اپنا لذیذ،اور پیارا ساسوال پہلی بار پوچھ رہا ہو کہ "کیا تم مجھ سے شادی کرو گی؟"

اُس نے شرارت بھری خوشی سے اُسے جواب دیا"ہاں، میں تم سے شادی کرنے پر راضی ہوں۔"

صالح اُس کی منظوری سے بے انتہاخوش ہے جیسے وہ اسے اپنی زندگی میں پہلی بار سُن رہا ہو، اور وہ ہزار ڈالر جو اُس نے اپنی پرانی پتلون کی جیب میں دفن کر دیے ہیں اُسے دن رات اِس اُمید سے زندہ رکھے ہوئے ہیں کہ مستقبل قریب میں وہانہیں اپنی محبوبہ کو جہیز کے طور پر دے گا۔ وہ اپنے سفید فرشتے کا سفید

عروسی لباس پہنے ہوئے خواب میں مسکراتا ہوا اُس کی طرف بھاگتا ہے مگر دو محبت کرنے والے دلوں پر کوئی رحم نہیں کرتا۔۔ وہ تنگ کمان کے ساتھ چیختا ہے جیسے کمان کی تار اتارنے کے لیے بے چین ہو "ہُودا، میں تم سے پیار کرتا ہوں... کے... کے۔"

(9)
غروبِ آفتاب چُھپتا نہیں

اُس کا دوست اُسے تسلی دیتے ہوئے کہتا ہے کہ "گھبراؤ نہیں میرے دوست! ہر انسان کو کوئی نہ کوئی چیز خوف میں مبتلا رکھتی ہے اورکیا تم اس بات کا یقین کر سکتے ہو کہ ہمارا آرمی کمانڈر خون بہانےسے ڈرتا اور گھبرجاتا ہے لیکن اُس نے فلسطینیوں کے خلاف ایک سے زیادہ نسل کشی کی کارروائیوں کی صدارت کی ہوئی ہے؟

اُس نے اپنی حالت پر شرمندہ ہوتے ہوئے اسے جواب دیا "لیکن میں خون سے نہیں ڈرتا، بلکہ میں اِس سے بہت لطف اندوز ہوتا ہوں، اور اسے تباہ کرنے والے فلسطینیوں کی گردنوں سے ہٹانا میرے لیے فخر کی بلندی ہے۔ لیکن کیا ہی شرم کی بات ہے کہ جب سورج غروب ہوتا ہے تو میں بہت زیادہ خوفزدہ ہو جاتا ہوں اورایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے مجھے اس کائنات کے اندھیرے میں تنہا چھوڑ دیا گیا ہو۔ بد روحوں سے بھرے ہوئے شیاطین ہیں جو اپنے داغدار بیلچوں سے میرے

جسم کو تباہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور میرے بچوں کی روحوں کو اغوا کر کے انہیں جہنم میں لے جانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ یقینا ایک خوفناک چیز ہے اور میں ان لمحات سے ڈرتا ہوں جو میں تصوراتی شیطانوں کے ساتھ جدوجہد میں گزارتا ہوں جو اصل میں موجود نہیں ہیں۔ "کوئی اور ہے جو اسے دیکھتا ہےاور اسی وجہ سے وہ مجھے سخت اذیت دیتا ہے۔"

- اُس کا دوست اس کی حالت پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتا ہے، ''واقعی یہ تو ایک عجیب معاملہ ہے"۔
- "میں نے اپنے آپ کو ایک سے زیادہ سائیکاٹرسٹ کے سامنے پیش کیا لیکن مجھے کوئی بھی فائدہ نہیں ہوا، کیونکہ اُن میں سے کوئی بھی میری مدد نہیں کر سکا۔ نہ ہی تو سورج آسمان پر اپنی جگہ سے چمٹا ہواہے،اور نہ ہی غروب آفتاب چُھپ کر آتا ہے تاکہ یہ شیطانی روحیں بیدار نہ ہو سکیں۔ اُن کے زہریلے عذاب سے مجھے پریشان کرنے کا ارادہ رکھتے ہوئے ان کی دنیا سے بھاگنا،" فوجی نے جواب دیا کہ صیہونی گھبراہٹ اور درد کی کیفیت میں ہے"۔

- "لیکن اس نایاب طبی حالت کی آخر وجہ کیا ہے؟" اُس نے پھر اپنے دوست سے پوچھا؟

"میں نہیں جانتا لیکن مجھے اُمید ہے کہ غروبِ آفتاب خفیہ طور پر نمودار ہوگا۔" سپاہی اُمید اور امید کے لہجے میں زور سےچیختا ہے۔

دوست اس پر خاموش رہتا ہے اور اُس کی نظریں افق کی طرف مڑ جاتی ہیں اور اس دن کی طرف جب وہ لمحہ بہ لمحہ اپنی یاد کو نگلنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ ایسا کرنے میں ناکام رہتا ہے اور غروبِ آفتاب اُس کی نیند میں خلل ڈالنے والی یادوں کے ساتھ اُسے جھنجھوڑ دیتا ہے۔ اور اسے ایک ملعون سیسیفین میں بدل دیتا ہے جو اُس کے عذاب کا انجام یا اس کی سزا کے خاتمے کو نہیں جانتا تھا اور اُس دن ، سورج جدائی کی دیوار کے پیچھے پھسلنے ہی والا تھا۔ وہ رات کو گیٹ کی حفاظت کا ذمہ دارتھا اور دن بھر کی نگرانی، راہگیروں کی تلاشی لینے اور انہیں اذیت دینے، رکاوٹیں ڈالنے، گرفتار کرنے، تاخیر کرنے اور اُن کی تذلیل کرنے میں ماہر تھا۔ اِس

ظالمانہ کھیل میں جتنا اُس نے ان پر ظلم کیا تھا اس کی مثال نہیں ملتی۔

وہ فلسطینی عورت اِس الگ تھلگ شہر میں داخل ہونے کے لیے گیٹ عبور کرنے آئی تھی جو ہر طرف سے ایک شریر کی طرح دِیوار سے گھری ہوئی تھی۔وہ اپنے ساتھ چھ بچوں کو گھسیٹ رہی تھی، اور اپنے پیٹ میں گوشت کا ایک ٹیلہ لے جا رہی تھیوہ ایک جنین جو زندگی میں آنے والی تھی۔ اُس نے اسے اور اُس کے چھوٹے بچوں کے جھگڑے میں خاص طور پر خوشی محسوس کیاور اسے ایک تکبر کے ساتھ جواب دیا ۔ اُس عورت کی کمزور خصوصیات، اُس کے ظاہری پیلے پن اور اُس کے مسلسل ہانپنے کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اُسے اس وقت تک اذیت دینے کے اپنے لطف کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کا فیصلہ کیا جب تک کہ وہ اندھیرے میں داخل نہ ہو جائے۔ رات ہو چکی تھی اور وہ وہیں زمین پر لیٹ گئی اور اُس کے بچے دیوار کے دروازے پر صبح تک اپنے دکھ سے نجات پانے کے لیے موجود تھے۔

اُسے توقع تھی کہ وہ اپنی ذلت کے سامنے سرتسلیم خم کرے گی، لیکن اُس نے ایسا نہیں کیا، بلکہ اُس کے ظلم کی پرواہ نہ کرتے ہوئے جلدی سے اپنے بچوں کو اکٹھا کیا اور واپس جانے کے لیے پلٹی ۔اُس کی اس جسارت پر اُس کے زنگ آلود سینے میں غصے کی آگ بھڑک اٹھی اوراُس ظالم نے گولیوں کا ایک ہجوم اُس کے اور اُس کے بچوں کے اجسام میں منتقل کر دیا اور وہ لمحوں میں زمین پر ڈھیر ہو گئی۔ اُن کے اجسام سے گرم خون کا تالاب اِس خوفناک منظر سے بچنے کے لیے مکمل طور پر غروب ہو چکا تھالیکن اُس عورت کی آنکھیں بند ہونے سے انکار کر رہی تھیں۔اُس کو یوں محسوس ہوا کہ جیسے وہ اُس سے بات کر رہی ہے اور اسے بدلہ لینے کی دھمکیاں دے رہی ہے ۔جب سپاہی اُس کی آنکھیں بند کرنے سے قاصر تھے تو اُس نے عورت پر گولیوں کی ایک نئی بیراج برسائی یہاں تک کہ اس کا پیٹ پرانے دھات کی چھلنی کی طرح نظر آنے لگا، لیکن اس کے باوجود، وہ آنکھیں کھولے کھڑی رہی اور اسے بدلہ لینے کی دھمکی دے رہی تھی۔

- "ولكن ما ذنب زوجتي وأطفالي الصّغار بما اقترفت يداي؟!"يسأل الأرواح الشّريرة التي تطارده، فتردّ عليه

بسؤال تنفخه في وجهه بلسان لهيب:"وما ذنب تلك المرأة الفلسطينيّة وأولادها الصّغار لتقتلهم دون رحمة؟!"

- "لیکن اس سب میں میری بیوی اور میرے چھوٹے بچوں کا کیا قصور ہے جو میرے ہاتھوں نے کیا؟!" اُس سپاہی نے اُن بد روحوں سے پوچھا جو اُس کا پیچھا کر رہی ہیں، اور وہ اس کے جواب میں اس سوال کا جواب دیتے ہیں جو اس کے چہرے پر آگ بھڑکتی ہے۔ اور اُس فلسطینی عورت اور اس کے چھوٹے بچوں کا کیا قصور تھا کہ تم نے انہیں بے رحمی سے قتل کر دیای؟" لا ...لا ... لن يقتل أحد أيّاً كان زوجتي وأولاديّ الصّغار، دعوهم يعيشون، دعوهم يأكلون ويشربون ويكبرون، هم سيموتون في يوم ما، ولكن ليس الآن؟" يرجو الجنديّ الأرواح متضرّعاً.

’’نہیں...نہیں...کوئی میری بیوی اور میرے چھوٹے بچوں کو نہیں مارے گا، انہیں زندہ رہنے دو، انہیں کھانے پینے دو اور بڑے ہونے دو، وہ ایک دن خود ہیمر جائیں گے، لیکن ابھی نہیں؟‘‘ سپاہی روحوں سے التجا کرتا ہے۔

روحیں سخت قہقہوں سے گونجتی ہیں، اور مضبوطی سے کہتی ہیں ''انھیں اب مرنا چاہیے۔''

"نہیں، میری چھوٹی بیٹی راحیل کو میں دنیا کے تمام انسانوں سے زیادہ پیار کرتا ہوں لیکن یہ حقیقت بھی شاید اُسے زیادہ دیر تک زندہ نہیں رکھ سکے گی۔وہ کسی دیوانے کی طرح اپنے کمرے سے نکلا اورجلدی سے گھر کی سیڑھیاں اترتا ہوا باورچی خانے کی طرف گیا جہاں اُسے اپنی حاملہ بیوی اور دو بچے کھانے کی میز کے گرد جمع ہوئے نظر آئے۔ وہ اُن کی حیرت کو لاتعلقی سے دیکھتا ہے، اور انہیں اپنی مشین گن کی گولیوں سے چھیدنا شروع کر دیتا ہے۔اُس کی شروعات اپنی بیٹی راحیل سے ہوتی ہے جو موت اور قبروں سے ڈرتی ہےاور جِسے وہ پوری انسانیت سے زیادہ پیار کرتا ہے۔اُس کے تخیل میں اس وقت مقتول فلسطینی عورت کی گھورتی ہوئی آنکھیں ہیں جن سے مخاطب ہو کر وہ چِلا رہا تھا "یہ میری بیوی اور میرے بچے ہیں، اِن کو میرے علاوہ کوئی نہیں مارے گا--- سُنا تم نےلعنتی عورت!"

(10)
نور کا نسب

اُس کے مبارک نسب کا خون بچپن سے ہی اس کی گہرائیوں، ضمیر اور شریانوں میںدوڑتا ہے اور اِس خواب کو پروان چڑھانے کے لیے اُسے الازہر الشریف میں اپنی اسلامی تعلیم مکمل کرنے کے لیے قاہرہ کا سفر کرنا ہے تاکہ وہ خود کو سمجھ سکے اور مسلم قوم کے لیے بھی فائدہ مند ہو۔ کئی نسلوں سے، اُس کے خاندان کے مرد، ایک کے بعد ایک، اِسلامی قانون کا جھنڈا اٹھائے ہوئے ہیں، اور اس کے والد، دادا، اور اس کے خاندان کے افراد نے پورے فلسطین میں سفر کیا، اور اپنےکے جھنڈے کو اٹھائے ہوئے ہیں۔ دین، خیرات، نیکی اور تعمیر کی جستجو بچپن سے ہی اُس کے اندر پنپ رہی ہے اور وہ اپنے بچپن سے ہی نماز، روزہ، عبادت، نیکی، اور صدقہ و خیرات کا پابند ہے۔وہ بچپن سے ہی قرآن پڑھتے تھے اور فجر کی نماز کے دوران اکثر جماعت کی امامت کرتے تھے۔ اُن کی زندگی کے تمام پروگرام ایک ہی مقصد کے مطابق تھے، جو کہ اپنے

اسلامی علوم کو مکمل کرنے کے لیے الازہر الشریف میں جانا تھا۔ اُس کی منگیتر نے اُسے اِس پروگرام کے مطابق منتخب کیا تھا کیونکہ وہ بھی اُن ہی کی طرح ایک نیک اور عبادت گزار عورت تھی اورقرآنِ پاک کے بہت سے حصے حفظ کر چکی تھی۔وہ بھی اپنے منگیتر کی طرح الازہر الشریف میں اسلامی علوم کی تعلیم حاصل کرنے کی خواہش رکھتی تھی۔

اُسے خود کو اور اپنی کتابیں باندھنی پڑیں اور شادی کے بعد اپنی منگیتر کے ساتھ قاہرہ کا سفر کرنا پڑا تاکہ یونیورسٹی میں داخلہ لینے کے بعد وہ اسلامی علوم کی تعلیم حاصل کر سکیں، لیکن شیطانی کوکھ سے پیدا ہونے والی تقسیم کی دیوارأُن کے سامنے ایک رکاوٹ کے طور پر کھڑی ہو گئی تھی۔ ،اِس دیوار نے انہیں اپنے قدیم شہر سے باہر سفر کرنے سے روکا اور اُن کے خوابوں کو چکنا چور کر دیا۔

اِس کے باوجود، اُس نے اِس حقیقت کو قبول کیا تھا کہ اگرچہ دِیوار نے اُس کے زیادہ تر دوستوں کواُس سے دُور نہیں کیا تھا لیکن سرحدوں اور دروازوں پر کافی

سارے لوگوں کو موت کے گھات اتار دیا تھا۔ پھر اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے مطلوبہ منصوبے کو چھپاتے ہوئے خاموشی سے کاروائی کر ے گا۔ اُس کی زبردست خاموشی اور حکمتِ عملی بالآخر کامیاب ہوئی اور فیصلہ کن دھچکا لگانے کے لیے اُس نے اپنی شادی کی رات کو اس عورت کے لیے منتخب کیا جسے اُس نے اپنی تلخ زندگی میں ایک ساتھی کے طور پر منتخب کیا تھا۔ نماز ادا کی، اور اُسے صبر اور احترام کے ساتھ ادا کرنے کے بعد، وہ اپنے چھوٹے سے تھیلے میں ایک پستول اور بموں کا ایک سیٹ لے کر باہر نکل گیا، اور اُس نے شہر میں گھسنے کے اپنے طے شدہ منصوبے کی تفصیلات یاد کیں۔ اندرونی یہودی مذہبی انسٹی ٹیوٹ؛ جہاں وہ مرکزی کلاس روم میں اُن سب کو موت کے گھاٹ اتارنے کے ارادے سے داخل ہوا تاکہ اپنے دوستوں کے قتل کا بدلہ لے سکے اور اُس کے مطالعہ کے خواب کے لیے جواُن ظالموں کی وجہ سے پروان نہ چڑھ سکا۔ ااپنی مقدس سرزمین کے لیے ، اور اپنی منگیتر کے لیے جِس سے وہ بے حد پیار کرتا ہے، اور

جِسے اب اپنے ساتھ الازہر الشریف نہیں لے جا سکے گا۔۔۔

انسٹی ٹیوٹ میں داخلہ اُس کے سنہرے بالوں والی خصوصیات کی وجہ سے کافی آسان ہو گیا تھا، جو کہ اُسے اپنے والد کی ترک نژاد دادی سے وراثت میں ملی تھی، جن سے اس کے دادا نے کئی دہائیاں قبل قاہرہ میں اسلامی علوم کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد شادی کی تھی، اور وہ اس کے ساتھ اپنے پرانے شہر لوٹ آئے تھے۔ جہاں وہ رہتی تھی، مر گئی، اور دفن ہوئی تھیں۔

زمین پر پانی کے چھینٹے کی طرح ہلکے سے قدم اٹھاتے ہوئے وہ مرکزی ہال میں پہنچا اور بجلی کی تیز رفتاری سے اپنے بموں اور پستول سے ہر ایک پر موت کے بادل پھیلانے لگا اور ہر ایک کو موت کے جہنم میں بھیج دیا۔ پھر اُس نے اپنے آپ کو وعدے کی ہوئی جنت کے حوالے کر دیا، اور اُس نے اپنے جسم کو اُن کے پیروں سے لات مارنے کے لیے چھوڑ دیا اور اسے کئی دنوں تک فریج میں قید کر دیا گیا۔ کنٹینر کو جلدی سے رات کے مُردہ کودفن کرنے کی اجازت دینے سے پہلے، گویا یہ ایک ایسا فعل ہے جس کو ظاہر کرنا منع ہے۔

اُس نے اپنی دلہن سے شادی نہیں کی، اور وہ اپنے سفید لباس میں اِس بات پر یقین کیے بغیر اس کا انتظار کرتی رہی کہ وہ اس سے اپنا وعدہ پورا نہیں کرے گا، اس سے شادی نہیں کرے گا، اور کبھی واپس نہیں آئے گا۔ اُس کی عادت نہیں ہے کہ وہ اپنے آپ سے کیا ہوا وعدہ پورا نہ کرے، لیکن لگتا ہے کہ وہ زندگی میں پہلی بار اپنا وعدہ پورا نہیں کر سکے گا، اور وہ اُس کے پاس واپس نہیں آ سکے گا۔ اِس لیے ضروری ہے کہ وہ خود اُس کے پاس جائے، اور اگر وہ صالح علماء کے نسب سے ہے تو وہ خالص شہداء کے نسب سے ہے، کیونکہ اُس کے خاندان میں کوئی ایسا گھر نہیں ہے جس نے شہید نہ دیکھا ہو۔ اور اُس کا باپ بھی ایک شہید کا بیٹا تھا، اور اُس کا دادا ایک شہید کا بیٹا تھا، بلکہ اس کا متوقع بیٹا جو اُس سے نہیں تھا، اسے بھی شہادت کا خواب دیکھنا چاہیے، اس لیے اسے صرف شہید ہونا ہے۔ بالکل اسی کی طرح؟

اُس نے میقات پر اپنا سفید لباس اتار دیا، اور جب متوقع وقت آیا تو نہا کر کنگھی کی، خوشبو لگائی، خود کو سجایا، بارود سے بھری ہوئی بیلٹ باندھی، اور اُس جدائی

کی دیوار کی طرف چل پڑی جِس نے ہر اُس شخص کو چھین لیا تھا جِس سے وہ پیار کرتی تھی۔ اسے اُس کے دروازے کی دہلیز پر کھڑے ہونے کا حکم دیا گیا، لیکن اُس نے ایسا نہیں کیا، اور مناسب وقت پر، وہ آگ کے انگارے میں بدل گئی اور اُس نے اپنے اردگرد موجود تمام صہیونی فوجیوں کو جلا ڈالا۔ جیسے وہدیوار کا مذاق اڑای رہی ہ جِس کے کچھ حصے دھماکے سے منہدم ہو گئے تھے۔ اُس کی دھماکہ خیز پٹی کے ٹکڑوں سے اُس نے ہچکچاتے ہوئے اپنی شادی کا پردہ اپنے کندھوں پر اٹھایا اور اُس کی روح کے لیے افق کی طرف لہرایا، جو اُس کی روشنی کی خالص لکیر میں شامل ہونے کے لیے اپنے راستے پر رواں دواں ہے۔

(11)
دیوار نے کیا کہا؟
(1)
"جیلر بھی قید میں ہے"

یہ کام اُسےپُرلطف اور تفریحی لگ رہا تھا کیوں کہ اُس دروازے پر کھڑے ہو کر وہ باہر اور اندر کا نظارہ کرتا ہے، اور اُس کے ذریعے وہ لوگوں کو اذیت دینے اور گالیاں دینے میں اِس کام سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ اُس نے سوچا کہ وہ ایک جیلر ہے جو فلسطینیوں کو تشدد کا نشانہ بنا رہا ہے، لیکن جب اسے یہ معلوم ہوا کہ کسی شخص کو دِیوار کے پیچھے، دِیوار کے سامنے یا دِیوار کے دروازے پر قید کیے جانے میں کوئی بڑا فرق نہیں ہے تو اُس نے منشیات کی اضافی خوراک لے کر خودکشی کر لی---- .

(2)

" الرمثوی کی قبر نامکمل ہے"

اس قبر میں موجود شہید کا نام تو کسی کو نہیں معلوملیکن سب اُسے الرمثوی کی قبر کہتے ہیں، کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اُس کا مالک شمالی اردن کے شہر رمتھا سے فلسطینیوں کے شانہ بشانہ لڑنے آیا تھا، اور وہ وہیں مر گیا تھا۔ اسی علاقے ، اور اسی گھر کے باغ میں دفن کیا گیا جس سے وہ گزرا کرتا تھا اور اپنی شہادت کے وقت اپنے اہل و عیال کا دفاع کرتے ہوئے دنیا سے گیا۔ قبر اس گھر کے طاق کا سایہ اور اُس کے لیے فخر کا ستون بنی ہوئی تھی۔ درحقیقت، وقت کے ساتھ اس خاندان کےگھر کا نام الرمثاوی رکھا گیا، اور خاندان کے لوگوں نے خود کو الرمثوی خاندان کا نام دیا۔

جب فلسطینیوں کے پہلو میں دیوار ڈالی گئی تو قبر کو گھر سے کاٹ دیا گیا اس طرح کہ گھر دیوار کے مشرق میں تھا اور قبر اس کے مغرب میں تھی۔ قبر سے محروم ہونا؛درحقیقت قبر کو اپنے خاندان سے جلاوطنی کا غم تھا، جس سے وہ کئی سالوں سے قریب تھا، اور چونکہ

الرمثاوی کے نزدیک نہیں تھا، اِس لیے اُس نے اس قبر کو گھر کے پاس لے جایا گیا دیوار کے دوسری طرف۔، اور صبح وہ دوبارہ گھر کے باغ میں اپنے گھر والوں کا انتظار کر رہا تھا کہ وہ اس پر اُگنے والے پھولوں کو پانی دیں، اوراُس نے لعنتی دیوار کی خواہشات کی پرواہ نہیں کی!

(3)

"جدائی کی دیوار کے لیے کوئی محبت کی کہانی نہیں ہے"

یہودی نژاد امریکی صحافی اپنی صحافتی شہرت اور میڈیا کے جرات مندانہ کارناموں کی وجہ سے جو کام اسے سونپا گیا تھا اسے انجام دینے کے لیے امریکہ کی سب سے دور دراز ریاست سے آیا تھا۔ اُسے دیوار جدائی کے تجربے کا مشاہدہ کرنا پڑا۔ ہر اُس شخص کی حمایت میں مضامین اور کہانیاں لکھنا جو اِس جگہ پر اپنی موجودگی کو تحفظ کے لیے جائز اور ضروری سمجھتا ہے... فلسطینیوں سے چھینے گئے ان کی زمینوں پر غاصب یہودی!۔

سچ تو یہ ہے کہ اُس کا تعلق صرف اس میڈیا پروپیگنڈہ کام کے بدلے جس میں بہت سے صفر کے ساتھ بہت سی رقم پر اتفاق ہوا ہے جو کہ سچائی یا انصاف سے خالی ہے، اور کون کہتا ہے کہ اُسے سچائی اور انصاف کی پرواہ ہے؟ پیسہ ہی اُس کے لیے اہم ہے اور اُس کا بڑھتا ہوا بینک بیلنس ہی اُس کی زندگی کی جنت ہے۔

لیکن اُس کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ اُس کا قلم جو چاہتا ہے لکھتا ہے اور اُس کی بات مانے بغیر اُس نے اِس دیوار کے سائے میں ایک محبت کی کہانی لکھنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ ایسا کرنے میں کامیاب نہ ہوسکا۔ اُس نےاِس دیوار کی وجہ سے کئی اداسی کی کہانیاں، اور اُس نے کئی صفر کے ساتھ ادائیگی کا آرڈر (چیک) پھاڑ دیا، اور اُس نے اپنی پہلی کہانی اِس دیوار کے خلاف فلسطینی مظاہرین کے ساتھ گزارتے ہوئے لکھی۔ اُس کی تصاویر بین الاقوامی میڈیا میں اِس عنوان کے تحت سرفہرست ہیں "صیہونی قابض افواج کی گولیوں سے ایک امریکی صحافی کی موت۔"

(4)

ایک پورٹل کافی نہیں ہے

اس بستی کی دنیا تک سوائے دیوار جدائی کے اس گھٹیا دروازے کے کسی اور کی رسائی ممکن نہیں ،اور اگر یہ بند ہو جائے اور اکثر ایسا ہوتا ہے تو بستی والے کسی بڑی جیل میں محض قیدی بن کر رہ جاتے ہیں جہاں کی دیواریں صرف جدائی کی دیوار ہوتی ہیں اور جس کی چھت ایک کھلاآسمان۔

ہر صبح، وہ اپنے پرانے ٹرک کو اپنے فلسطینی کارکنوں کے بوجھ کے ساتھ گیٹ کی طرف لے جاتا، جہاں انہیں گھنٹوں انتظار اور ذلت کا سامنا کرنا پڑتا، اِس امید پر کہ انہیں گیٹ سے باہر جانے کی اجازت دی جائے گی، تاکہ وہ اپنے اہل خانہ کے ساتھ واپس جا سکیں۔ اُن کے دکھی دن کے لیے وہ زمین پر بیٹھا رہا، اس انتظار میں کہ سپاہیوں نے اسے وہاں سے جانے کی اجازت دی، تاکہ وہ اگلے دن وہاں سے واپس آ سکے۔

اُن تمام فلسطینی مزدوروں کے گزرنے کے لیے ایک گیٹ کافی نہیں ہے، یہاں تک کہ جب ایک ملعون استعمار

نے اپنی مشین گن سے گیٹ پر موجود مزدوروں میں سے بیس کو مار ڈالا، تب بھی اُن کے لیے ایک گیٹ کافی نہیں تھا۔۔ اِس لیے وہ اپنے ٹرک میں بیٹھا ہوا اُن کے ساتھ بھاگا اور اُسے گیٹ سے ٹکرا دیا۔ اِس طرح سے اُس نے دیوار کا کچھ حصہ تباہ کر دیا اور اپنے ٹرک کے پہیوں کے نیچے کچھ سپاہیوں کو بھی کچل دیا، اور اُس نے دیکھا کہ زمین کشادہ ہے، بغیر کسی گیٹ، دیوار یا فوجیوں کے----

(5)

پاؤں لوٹنے کے خلاف کوئی قانون نہیں

شوگر کی بیماری نے پرانے محلے کی مسجد کے مؤذن کا دایاں پاؤں کھا لیااور اسے بتایا گیا کہ اُس کے لیے دو فٹ کا ٹھوس میڈیکل پلاسٹک بنانا ممکن ہےلیکن خواب میں ایک فون نے اسے آواز دی کہ اسے اپنے لیے دو پاؤں بنانے ہیں اُس کی زمین پر جو اب علیحدگی کی دیوار کے پیچھے واقع ہے۔ اُس نے اکثر اوقات اپنی سرزمین تک پہنچنے کی کوشش کی اور لیکن ہر بار اُس کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔

وہ بلوط سے لکڑی کے پاؤں کا خواب دیکھتا رہا اور ایک لمحے میں اُس کے یتیم پاؤں نے اِس خواہش کو پورا کرنے کا ارادہ کیا اور اسے نرمی کے ساتھ اس کے جسم سے اٹھا لیا اور اُس نے کسی صہیونی فوجی کے روکے بغیر دیوار کے دروازے کو عبور کیا، اور پہاڑی باغ میں پرانے بلوط کی طرف چل پڑا۔ میں نے کہا کہ "خدا عظیم ہے"۔

(6)

اچھی نسل کے گھوڑے ہمیشہ اپنے مالکان کے پاس واپس آتے ہیں

صہیونی جیل میں اُنہیں بدترین جسمانی اور نفسیاتی اذیتیں دی جاتی تھیں اور وہ اس وقت تک انہیں اذیتیں دینے سے باز نہیں آتے تھے جب تک کہ وہ انہیں اپنا جاسوس نہ بنا لیں۔ کسی کو شک نہیں تھا کہ نوجوان لڑکے اُن کے گھر والوں، پڑوسیوں اور لوگوں کے جاسوس بھی ہو سکتے ہیں۔ اِس لیے وہ ان کو اِس شرمناک شفاعت کے ساتھ جیل سے باہر لے گئے۔

انھوں نے صیہونی فوجیوں کو فلسطینی انقلابیوں اور مظاہرین کے بارے میں بہت سی چھوٹی چھوٹی خبریں پہنچائیں، پھر انھوں نے انھیں فلسطینی انقلابیوں کی جانب سے کیے جانے والے سب سے بڑے مزاحمتی آپریشن کی تفصیلات سے آگاہ کیا اور انھیں انقلاب کے بیس ہیروز کو گھیرنے کی معلومات فراہم کیں۔ انہوں نے اس کام کے لیے صیہونیوں سےایک بڑی رقم لی تھی۔

کمانڈو آپریشن کے لیے مخصوص وقت پر، ٹارگٹ ہوٹل میں صہیونی فوجیوں اور باغیوں کی گرفتاری کے لیے گاڑیوں کا ایک ہجوم تھا۔ انھوں نے زیادہ انتظار نہیں کیا کیوں کہ انھیں اپنے کیمپ سے مدد کے لیے فوری کال موصول ہوئی تھی، جس کو مکمل طور پر تباہ کر دیا گیا تھا۔وہ باغی جنہوں نے انہیں اپنے چھوٹے، خالص نسل کے گھوڑوں سے گمراہ کن معلومات کے ذریعے دھوکہ دیا جس کا اصل میں کوئی مطلب نہیں تھا۔ یہ توصرف اس کے لوگوں کو واپس کیا جا سکتا ہے۔

(7)

مُردے نہیں چھوڑتے

صہیونی افسر نے مگرمچھ کے سے چہرے کے ساتھ رعونت سے بھرے لہجے میں کہا! "کوئی بھی اِس جگہ پر بغیر کسی استثنا کے باقی نہیں رہے گا، صرف قبروں میں رہنے والے مُردوں کو چھوڑ دیں گے۔"

بوڑھا فلسطینی اُس صہیونی افسر کی لاعلمی پر ہنسا، زمین پر لیٹ گیا، اور کہا ''تو میں یہیں مر جاؤں گا پھر۔'' اُس نے آنکھیں بند کر لیں اور ابدی نیند سو گیا۔

افسراُس بوڑھے آدمی کے مُردہ وجود کو منتقل کرنے کے لیے وہاں پہنچا، لیکن وہ ایسا کرنے سے قاصر تھا۔ جیسے زمین الگ ہو گئی ہو اور اُس نے بوڑھے آدمی کو اپنی تہ کی گہرائیوں میں غرق کر کے اُسے دنیا کی نظروں سے اوجھل کر دیا۔

(8)

فینکس ایک حقیقت ہے، افسانہ نہیں

بچپن سے ہی اُس نے ایک پرندہ بننے کا خواب دیکھا تھا ایک ایسے پرندے کا کہ جِس کے دو پَر آسمان کی طرف اُڑتے ہوئے اگر چھوٹے ہوئے تو شیشے کے جیٹ طیارے سے دنیا کا سفر کرنے والے پائلٹ بننے کے خواب دیکھنے لگے۔ لیکن جب صہیونی جیل میں اُس کی ہڈیاں توڑ دی گئیں تاکہ وہ دوبارہ فلسطینی پرچم اٹھا کر دیوارِ علیحدگی کے خلاف مظاہرے نہ کرے تو اُس نے بے بس ہو کر آگ میں فینکس بننے کا فیصلہ کیا۔ اُس نے اپنے شہر کے سب سے اونچے پہاڑ پر کھڑے ہونے کے بعد اپنے بے بس ہاتھ فلسطینی جھنڈے پر رکھے، اپنے کندھے سیدھا کیے اور اُڑتے ہوئےفلسطینی جھنڈا دوبارہ افق پر لہرادیا ---جُدائی کی دیوار اپنے سائے میں کہیں غائب ہو گئی تھی!

(9)

پاگل لوگ بمقابلہ پاگل

''اُن جیسے دیوانے ہی پاگلوں کو سمجھ سکتے ہیں۔'' یہ اُس کا واحد جملہ ہے جس کے ذریعے وہ اِسدروازے کو پار کیے بغیر جُدائی کی دیوار کو عبور کرنے کی اپنی جادوئی صلاحیت کی وضاحت کرتا ہے۔

وہ گاؤں کے اِن قدیم دیوانوں میں سے ایک ہے جو اُس کی یادگاروں،اور نشانات کا حصہ بن چکے ہیں اور یہکوئی نہیں جانتا کہ اس کا دیوانا پن کب شروع ہوا یا کیوں ہوا؟ لیکن اُس کے گاؤں کے سبھی لوگ اُسے سمجھتے ہیں، تو سمجھدار، اورپاگل لوگوں میں سے ایک ہونے کے لیے وہ صرف سچ بولتا ہے اور صرف سچ کی پیشین گوئی کرتا ہے۔

جب جدائی کی دیوار بنی تو اُس نے اس پر طنز کی بارش کی اور سب کو تسلی دیتے ہوئے کہا کہ ''ڈرو نہیں، یہ دیوار دیوانگی سے زیادہ کچھ نہیں ہے، اور دیوانے سے کوئی نہیں ڈرتا، بلکہ دیوانے اورپاگل پن کے سب مخالف ہوتےہیں۔ اُس وقت سے، اُس نے جادو کی طاقت سے

دیوار پر قابو پالیا، اور وہ دیوار کے دائرہ اختیار سے باہر رہا...،وہ جب چاہتا ہے اُسے پار کرتا ہے، اور جب چاہتا ہے، واپس آ جاتا ہے۔ عکا، جفا اور غزہ کے ساحلوں سے مٹھائیاں اور تازہ مچھلیاں!!!۔

(10)

موت چیزوں کے برابر ہے

"اِنسان کی زندگی بالاشبہ اِس دنیا کی سب سے قیمتی چیز ہے"۔ یہ چیز جو اُس نے اپنے والدین اور کالج آف ہیومن میڈیسن میں اپنے اساتذہ سے سیکھی ہے اور اُس نے اندازہ نہیں لگایا ہوگا کہ اُس کے کالج سے باہر ایک فیلڈ ٹرپ اسے کچھ اور سکھائے گا۔ اُس نے اپنی پوری زندگی میں جو کچھ سیکھا تھا اُس کو کمزور کرنا یہ سفر صہیونی فوجی عملے کے ساتھ ایک میدان میں تھا جب اُس کے ایک دورے کے دوران علیحدگی کی دیوار کے پیچھے فلسطینی سرزمین پر ایک زخمی فلسطینی خونی تصادم کے بعد فوجیوں کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔ ایک پرانی مسجد کے صحن میں، اُسے توقع تھی کہ اُس زخمی فلسطینی کو اِبتدائی طبی امداد فراہم کی جائے گی، جیسا کہ انسانیت اور قیدیوں کے علاج کے لیے بین الاقوامی اصول موجود ہیں لیکن ایسا نہ ہوا۔

زخمی آدمی کی گرجدار چیخوں کے درمیان، جب اُس کی مدد کے لیے کی گئی چیخ و پکار لا جواب ہو گئی، تب

اُس نے انہیں ایک زندہ انسان کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے کا جیتا جاگتا سبق دینا شروع کر دیا۔۔ اُس دن، موت کی سرزمین پراُسے اپنے تمام سیکھے ہوئےاُصولوں کو بھولنا پڑا اور اُسے یقین ہو گیا کہ "مقصد" ہی اِس کائنات میں سب سے قیمتی چیز ہے۔۔!

اور اپنےاِس نئے، اورنوزائیدہ اصول کے ساتھ وفاداری میں، اُس نے ہر اس زخمی صیہونی کو مارنا شروع کر دیا جو اس کے ہاتھ لگ گیا تھاجب اسے ملٹری ہسپتال میں ڈاکٹر مقرر کیا گیا تھا۔ اُس نے اُن کے اعضاء کو خفیہ طور پر فروخت کر دینے کا سوچا جِس کے بدلے اُسے بہت زیادہ رقم ادا کی جائے گی جیسا کہ یہ زندگی کی ضرورت تھی۔ اُس کے لیے کوئی قیمت نہیں، اور "پیسہ" اِس زندگی کا سب سے بڑا مقصد تھا جو اُس نے اپنے واحد فیلڈ ٹرپ پر اِنسولیٹنگ وال کے لیے سیکھا۔

(11)

پرندوں کا انقلاب تاریخ سے باہر ہے

چونکہ انسان سالوں کو اپنے اہم واقعات کے ساتھ بیان کرتے ہیں، اِس لیے وہ پرندوں کی تاریخ سے ناواقف ہیں، جس میں کہا گیا ہے کہ "پرندے فلسطین کے جنگلوں، کھیتوں اور میدانوں میں سلامتی کے ساتھ رہتے تھے، یہاں تک کہ صہیونی دشمن نے انہیں کاٹ ڈالا"۔ درختوں کو کاٹ کر زمینوں کو بلڈوز کیا اور انسانوں کے درمیان ایک الگ دیوار بنائی جس کی وجہ سے پرندوں کو اُن کے گھونسلوں اور گھروں سے محروم کر دیا جب کہ ایساکرنے کااُنہیں کوئی حق نہیں تھا۔

اسے یہ بتایا گیا تھا کہ انسان پرندوں کو اُن کا حق واپس کر دیں گے، اور جب اسے طویل انتظار کرنا پڑا تو اس نے دیوار کے خلاف ایک زبردست جنگ شروع کر دی، اور قوت کی ایک ہی ضرب سے دِیوار کو کچل دیا۔ صیہونی جارحوں نے اُس کی زمین پر دوبارہ قبضہ کر لیا اور کٹے ہوئے درختوں کی باقیات پر اپنے گھونسلے بنائے--- میں نے اس کے لیے فتح کی تاریخ لکھی جو وہ ہر سال منائے گی۔

(12)

"دیوار کو آخر کار جانا ہی ہے"

ایک صبح جب اُس نے اپنی موجودہ زندگی میں علیحدگی کی دیوار (خود) کو دیکھاتو اپنے آپ کو ایک قابل نفرت دیوار پایا، جس میں ایک مظلوم اندرونی تھااور ایک جابرانہ بیرونی تھا۔ اُس نے سوچا، فیصلہ کیا، پھر منصوبہ بندی کی، اور جب صبح فلسطینی اور صیہونی بیدار ہوئے تو انہوں نے اسے تلاش کیا لیکن وہ اُن کو ن نہ ملی۔ وہ اِس گھناؤنے جرم میں شریک رہنے سے انکار کرتے ہوئے واپس چلی گئی تھی---

دِیوار سے دُور

(12)
کمپاس، کیل اور بارش کے قطرے

اگر آپ کا نام ہاشم ہے، اور آپ کی جیب میں پیتل کا ایک پرانا کمپاس ہے جو ایک موٹے نیلے اُون کے دھاگے سے بندھا ہوا ہے، تو اسے مت چھوڑنا اور آپ کو یقین ہے کہ آپ چوک کے مشکل ترین دنوں میں مر جائیں گے[1]۔ سردی کا موسم ہے اور آپ اکثر اپنے کوٹ کی جیبوں میں یا اپنی پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالتے ہیں تاکہ کوئی آپ کے ہاتھوں کی انگلیاں نہ دیکھ سکے جو صرف ننگے ناخن ہیں۔ -نطیفی [2]

---

1 ایام المسربانیہ: عوام کے نزدیک یہ موسم سرما کے چالیس سرد ترین دن ہیں۔

2 بیت نطیف گاؤں کے حوالے سے: یہ شہر ہیبرون کے شمال مغرب میں اس سے 21 کلومیٹر دور واقع ہے، اور سطح سمندر سے 425 میٹر بلندی پر واقع ہے۔ ہیبرون پہاڑ۔ اس کا رقبہ 44,587 دونم ہے۔ 1922 میں اس کی آبادی کا تخمینہ لگ بھگ (1,112) افراد پر تھا، 1945 میں تقریباً (2,150) افراد، اور 1948 میں ان کی تعداد (2,499) لوگوں تک پہنچ گئی، مسلح صہیونی تنظیموں نے اس گاؤں کو مسمار کر دیا، اور اس کے لوگوں کو بے گھر کر دیا، جن کی تعداد 1948 میں تھی۔ (2,499) لوگ، اور یہ 1948/10/21 کو تھا۔ 1998 میں اس گاؤں سے آنے والے پناہ گزینوں کی کل تعداد (18,995) تھی جو صیہونی 1949 میں اس کی سرزمین پر آباد ہوئے۔ اور کالونی (افیزر) 1958، 1958 میں روجیلیٹ کی بستی، اور 1958 میں نیو میخائل کی بستی۔ الطبانی اور دیگر۔۔

ایک ہی وقت میں، بہت سے لوگ اُسے جانتے ہیں اور کچھ ایسے بھی ہیں جونہیں جانتے؛ وہ کئی سالوں تک صہیونی جیل کی گہرائیوں میں قید کے بغیر صرف ایک' نام' تھا، لیکن اُس کے خاندان کے لوگ اُسے ایک ہیرو کے طور پر یاد رکھیں گے اور وہ ہمیشہ اپنے نام کے ساتھ یہ جملہ لگاتا تھا کہ "خدا اس کی اسیری کو توڑ دے"۔

وہ اِس وقت میرے تخیل میں ایک افسانوی نائٹ کی شکل میں مجسم تھا،کیونکہ اُس کا قد آسمان تک پہنچ گیا تھا،اور اُس کے ہاتھ زمین میں ایک ہزار سال پرانے زیتون کے درخت کی شکل میں لگائے گئے تھے، اور اُس کی آنکھیں بھیڑ کی طرح پریشان تھیں۔ میرے لئے اُس سے ملاقات کی کوئی اُمید نہیں تھی، اور میں نے پھر بھی یہ ماننے سے انکار کر دیا کہ ایک پرانے نیلے فلسطینی لباس میں سنہری چھڑی کے نشانات لپٹے ہوئے تھے۔ وہ شال جو سفید تھیاور ایک ایسے دن جب وہ بھول گیا تھا کہ وہ اُس کی ماں تھی، جس نے اسے جنم دیا اور اسے نو ماہ تک اپنے پیٹ میں رکھا تھاصہیونی دشمن

نےاسے بچپن میں ہی اس کے گلے سے چھین لیا، اور اسے اُس کے گھر میں پھینک دیا۔ قتل کی کوشش کے الزام میں، حراستی مراکز کی گہرائی جہاں ایک زمیندار نے اس کےباغات پر قبضہ کر لیا اور اس بنیاد پر وہاں کے درختوں کو ایک ایک کرکے اکھاڑنا شروع کر دیا کہ اُن کا کسان ایک فلسطینی تھا!

میں کسی بھی فانی انسانی عورت کی ماں بننے کی خواہش رکھتا تھا، اور میں نے سوچا کہ ایک افسانوی ماں اس ہی کے لائق ہے۔ یہ غائب ہیرو، جس کی ہمت کے بارے میں میں نے بہت ساری کہانیاں سنی ہوئی ہیں، صرف ایک زبّہ کی عظمت والی ماں کے لائق تھی۔ یا سیف بن ذی یزان کی ماں، یا علیسر، یا حجۃ الدر، جس کا وزن تقریباً پچاس کلو گرام ہے اور اس کے چہرے پر فخر کی سینکڑوں لکیریں ہیں، وہ کیسے ایک افسانوی ہستی کو جنم دے سکتی ہیں؟ ہاشم کی طرح؟

جس دن ہمیں بتایا گیا کہ ہاشم جیل سے رہا ہو گیا ہے تو میں نے ایک گہرا،اور خود غرضی سے لبریز احساس کا مظاہراکیا کیونکہاُس کے جیل سے نکلنے کے بعد،

میرا پکڑا ہوا خاندانی ہیرو کون ہوگا جس کے بارے میں میں اپنے دوستوں اور جاننے والوں کے سامنے فخر کروں گا؟

وہ اب اردن پہنچ گیا تھا جہاں اُس کا خاندان اپنے سوشل آفس میں اُس کے لیے ایک بہت بڑے خاندانی استقبال کا مظاہرا کرے گامجھے تقریباً جوش و خروش سے اُبکائی ہوئی،اور پھر مجھے کئی گھنٹوں تک درد شقیقہ کا سامنا رہا، اور پھر میں نامعلوم انتظار کے کھیل میں شامل ہوگیا۔

چند دنوں بعد ایک بڑی فیملی پارٹی ہوئی، جس کے دوران ہاشم کی واپسی کی تفصیلات کے بارے میں مختلف خبریں گردش کرنے لگیں اورہمیں معلوم ہوا کہ وہ پل کراسنگ کے ذریعے اردن میں اکیلا ہی واپس آیا ہے، اور جب ہمیں معلوم ہوا کہ وہ بہت ضرورت مند ہے تو ہم دیر تک روتے رہے۔ ایک نابینا لڑکی نے اُس کے ایک لفظ کہنے سے پہلے ہی اُس کی خوش بو سے اسے پہچان لیا تھا، اور ہمیں اس کے بارے میں اپنی کنجوسی پر شرمندگی ہوئی کہ جب ہمیں معلوم ہوا کہ اُس نے دنیا

کے ملبے سے چند دینار دے کر دو میٹر سیاہی کا کپڑا خریدا ہے۔ یہ کپڑا اُس نے اپنی ماں کے لیے ریدا تھا، جسے اُس نے اپنے بچپن میں ہمیشہ اپنے بھائیوں سے یہ کہتے ہوئے سنا تھا کہکیا تم نے اس لیےسیاہی کا لباس[1] خریدا ہے تاکہ تم ہمیں اس طرح تنگ کرسکو؟" اُس کی والدہ کا آخری خواب تھا کہ اُس کے پاس سیاہی مائل کڑھائی والا لباس ہو"۔

لیکن اُس کے لیے پیسے کم تھے اور وہ اُس کے لیے دوا نہیں خرید سکتا تھا([2]) جنہیں ریشم کی ضرورت ہے۔ میں نے سوچا کہ میں ایک گولڈن نائٹ کو زنجیروں میں جکڑے ہوئے شیر کو اپنی رسی سے گھسیٹتا ہوا دیکھوں گا، اورمیں نے یہ اندازہ لگایا تھا کہ خاندانی عدالت کی زمین پر اُس کے قدموں کا پیچھا کیا جائے گا، جو گستاخانہ بیڑیوں کے وزن کا مذاق اڑانے کے عادی تھے۔ زمین کے مالک اور حق کے خلاف جارحیت کرنے والے کے ساتھ؛ میں نے ایک لمحے کے لئے اپنی آنکھیں بند

---

[1] مونس سلک: یعنی یہ ایک ہی رنگ کے دو شیڈز پر مشتمل ہوتا ہے۔

[2] ریشم کی دوائی: ریشم کی گیندیں

کیں تاکہ اُن کے خاندان کے مردوں کے ساتھ اس کے داخلے کی تیاری کر سکوں، پھر میں نے انہیں کھولا، لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ واپس آنے والے شیر نائٹ کو دیکھیں جس کا میں نے ہمیشہ تصور کیا تھا۔لیکن میں نے ایک ایسے شخص کو دیکھا جو سردیوں کے پرانے کوٹ میں سفید داڑھی اور بکرے کے جیسے بالوں میں لپٹے ہوئے تھا اور جو بظاہر اعتماد کے ساتھ چل رہا تھا تا کہ اپنے بائیں پاؤں میں نظر آنے والے لنگڑے پن کو چُھپا سکے۔ اُس کے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالنے کو یقینی بناتے ہوئے میں نے اُسے سلام کیا اور وہاں سے بھاگ نکلا... اور میں باہر فرار ہونے کے لیے مناسب موقع کا انتظار کرنے لگا، لیکن اُس کی آواز وہی تھی جِس نے مجھے میرے ارادے سے باز رکھا اور یہ صرف اُس کی آواز تھی جس نے میری خواہش کو پورا کیا تھا۔ یہ ایک ایسی آواز تھی جس میں کہانیوں، جدوجہد، درد اور جدوجہد کی مکمل وراثت تھی، اوراُس کی آواز کسی خوشبو کے جنگل کے مانند تھی۔ الفاظ، آہیں، اور چیخیں؛ تمام سفاک فوجیوں، عام کتوں، بیڑیوں، کوڑوں

اور ٹارچر مشینوں کے ساتھ قیدی کی آواز سے کون بچ سکتا ہے بھلا؟! اُس کی آواز دشمنوں کے لیے ایک قبرستان ہے، اور ابتدا و انتہا کے لیےایک تسبیح ہے۔

اُس نے جیل میں اپنے تجربے اور مہارت کے بارے میں کبھی بھی بات نہیں کی تھی بلکہ اُس نے ہمیشہ یہ کہا کہ "ہم"۔ اُس نے ہمیں نام کے ساتھ ہیرو سے متعارف کرایا ، اور ایک کہانی کے طور پر جب کہ ہم اُس سے تجسس اور لالچ سے پوچھتے ، اور وہ ہمیںتفصیل سے جواب دیتا تھا۔ اُس دن صرف میں ایک ہی موجود تھا وہاں اور میں نے آسمانی آواز کے ساتھ اُس شخص کے زیادہ سے زیادہ قریب ہونے کا عزم کیا تھا، اور میں نے اُس کے تصوراتی تخیل کو اپنی یادداشت سے باہر دفن کر دیا تھا کیونکہ وہ میرے سامنے ایک وافر حقیقت کی صورت میں موجود ہے؟!

میں اکیلا نہیں تھا جو ہاشم کے اتنا قریب ہونا چاہتا تھا بلکہ ہر کوئی اُس شخص کی خاموشی کے بوجھ تلے دبے ہوئے اُس کے قرب کا خواہاں تھا۔ اُس کی شخصیت میں ایک دلکش اور متحرک وحی کی سی صلاحیت تھی۔

لیکن تمام لوگوں میں سے میں یقینا سب سے زیادہ خوش قسمت تھا جس کو اُسے سننے کا سب سے بڑا حصہ حاصل کرنے میں اور بہت سی خاندانی دعوتوں اور مقبول اجتماعات میں اُس کے ساتھ جانے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ اُس نے اپنی مقبول ساکھ کو مزید بڑھانے کے لیے اُس کی میزبانی کی، اور اس کے زیادہ تر سامعین کی فہرست کا جائزہ لیا۔

آخر کار وہ دن آ گیا جب ہاشم کا چہرہ، اُس کا وقت اور اُس کی توجہ صرف میرے لیے تھی، لیکن وہ ایک پردہ دار چہرہ تھا جس میں کسی گمشدہ سی اُداسی کے نقشے تھے، نہ کہ عظیم الشان پہاڑوں کا خطہ۔اُس نے اپنی گہری سمجھ بُوجھ سے اندازہ لگایا کہ ہجوم اُس کے ارد گرد سے کافی حد تک منتشر ہو گیا ہے، اوراُسے اپنے دکھوں کے ساتھ تنہا چھوڑ دیا گیا ہے، تاکہ وہ اسے جب چاہیں نگل لیں۔

ِکسی نے بھی اُن سے اُن کے حال یا مستقبل کے بارے میں نہیں پوچھا تھا اور اُنکی جیب کے خالی ہونے کے بارے میں بھی بہت کم لوگ جانتے تھے۔ شاید دو یا تین

لوگ تھے جنہوں نے اُس کے تانبے کے کمپاس یا انگلیوں کے ناخنوں کے راز کے بارے میں پوچھا تھا۔

جہاں تک میرا تعلق ہے، تو میرا مقدر ایک لیجنڈ نائٹ کا خواب دیکھنے والی عورت سے بدل گیا ہے، جو ایک مشہور روزنامے کے ایک ممتاز کالم میں شائع ہونے کے لیے موزوں پریس رپورٹ کے لیے ہاشم سے دلچسپ مواد حاصل کرنے کا بدنیتی سے سوچ رہی ہے۔غیر متزلزل دلچسپی کے ساتھ، ایک حقیقی ہیرو کو سننے کا موقع جسے ہر ایک نے اپنی زندگی کے ہنگاموں کے درمیان اُس کا منہ چڑانے کا فیصلہ کیا اور اُسے بدحواسی کے عالم میں دوبارہ گرفتار کر لیا گیا۔

ہاشم کی کہانیاں صرف اپنے وطن فلسطین کی طرف اشارہ کرتی تھیں اور اُس کی تمام سڑکیں ایک ہی راستے کی طرف لے جاتی تھیں، جو بیت نطیف کی طرف واپسی کا راستہ تھا۔ وہ جہاں بھی گیا، اپنی انگلیاں پھیلانے میں محتاط رہا اور اپنی جیب سے پیتل کا پرانا کمپاس نکال کر اشارے کی سوئی کو فلسطین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دیکھنے کے لیے۔ گویا وہ واپسی کی طرف جلدی

میں سفر کر رہا تھا،اور وہ ہمیشہ مجھے کہتا تھا کہ وہ جلد ہی یہاں واپس آ جائے گا۔ اپنے گاؤں میں، اور وہیں پڑوس (الطحطی)([1]) میں وہ اپنے خاندانی گھر میں رہتا تھا وہ اور ابو حلوہ [2]

وہاں گاؤں میں خاندان کی بیٹیوں سے ہی شادی کی جاتی تھی کیونکہ وہ عورتوں میں سب سے زیادہ خوبصورتی اور زرخیزی کی حامل ہوتی ہیں۔ گاؤنمیں وہ زمین کی آمدنی سے اپنے دس بچوں کے ساتھ زندگی گزارے گا کیونکہ وہ ایک کسان ہے، اورایک کسان کا بیٹا ہے، اور یہ سب سوچ کر وہ بے حد جذباتی ہو جاتا ہے۔ اُس کے رخساروں پر، جیسے اُس کے جانے کے بعد اچانک سےزندگی لوٹ آئی، اور وہ اپنی خواہشات میں خوش ہو رہا تھا کہ وہ اُن کی جیب کی قید سے اپنے ہاتھ چھڑا لے گا، وہ مجھے اپنے گاؤں کے تینوں محلوں کے خاندانوں کے اِرد گرد خوشی سے لے جاتا، اور بیت نطیف گاؤں کی چھوٹی چھوٹی تفصیلات کے بارے میں گفتگو کرتا

[1] الطحطی: یعنی جنوبی، جیسا کہ انہدام سے پہلے بیت نطیف گاؤں تین اہم محلوں پر مشتمل تھا۔
[2] ابو حلوہ: وہ بیت نطیف گاؤں کے خاندانوں میں سے ایک ہے۔

جیسا کہ وہاں کے مالکوں کے نام گنتا، اُن کے نسب کا پتہ لگاتا، اور ہر بار اِس بات کی تصدیق کرتا کہ اُس کے خاندان کے بہت سے افراد تقریباً لقمہ اجل بن چکے ہیں۔ ماضی میں 1984 میں اُن کی سرزمین پر حملہ کرنے والے یہودی گروہوں کے ساتھ ان کا دلیرانہ تصادم ختم ہو گیا تھا۔پھر اُس نے مجھے السہلہ، الملیحہ، بیر الصف، خیربیت ام الذیاب، خیربیت ام الروس کے گرد گھیر لیا۔ ، جسر العربین، مرہ ابوجہنم، اور سہل حمدہ [1]۔

جب شام کا وقت ہوا تو اُس نے کسی ورزش کی خواہش کے بہانے پیدل گھر واپس آنے کا تہیہ کر لیا اور میں یقین سے جانتا ہوں کہ اُس کے پاس اسے گھر لے جانے کے لیے بس کی ادائیگی کے لیے پیسے نہیں ہیں۔ اس لیے میں خاموش رہتا ہوں اور یقینا اُس کی ثابت قدمی کے لیے رحم کی شکایت اور بھیک مانگنے کی ضرورت ہے۔

ہاشم کے ساتھ میری رفاقت اتنی طویل نہیں تھی، کیونکہ مایوسی اُس پر بیماری کی سی کیفیت پیدا کر دیتی تھی،

[1] بیت نطیف گاؤں کے جغرافیائی مقامات کے نام

اور جب بھی میں اسے ڈاکٹر کے پاس لے جانے کی پیشکش کرتا تھا تو وہ یہ کہہ کر انکار کر دیتا کہ "میں اپنی جانچ کے لیے ایجنسی ([1]) کے حکیم کے پاس جاؤں گا۔

پھر میں ہنستا ہوں، اور وہ بھی ہنستا ہے، اور ہم کسی بھی موضوع پر بات کرتے ہیں سوائے اُس کے ہاتھوں کے ناخن کے جو صہیونی جیل میں تشدد کے باعث مکمل طور پر ہٹا دیے گئے تھے اور جن کے بارے میں میں نے سوال کو کسی اور وقت تک ملتوی کر دیا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ کب ہو گا؟ اور یہ جانے بغیر کہ میرے سامنے مزید وقت بھی نہیں ہے کیونکہ ہاشم اسی دِن اپنے گھر میں خاموشی سے مر گیا تھا۔اُس کے دنیا سے جانے کے بعد ہی اُس کی ماں نے مقدس گھر کی زیارت کا خواب پورا کیا۔ وہ دوسری دنیا میں چلا گیا تھا---.

ہاشم اپنے ہاتھ میں کمپاس لے کر مر گیا، اور اُس کے ہونٹوں پر ایک پاکیزہ مسکراہٹ تھی ، اُس کی روح کی

---

[1] کلینک ڈاکٹر ریلیف ایجنسی(UNRWA)۔

طرح، جس نے مرابانیہ کی راتوں میں موسم گرما کی بارش کے بغیر اپنے جسم کو چھوڑنے کی پرواہ نہیں کی تھی، جیسا کہ اُس کی توقع تھی، جب تک کہ وہ اپنے وطن فلسطین کی طرف پرواز کرنے کے لیے آزاد تھا، ہمیشہ کے لیے وہاں رہنے کے لیے۔

(13)
توہم پرست ابو عرب کا افسانہ [1]

"انہوں نے اسے سارڈینز کے ایک ڈبے میں بیچا اور اُس پر اپنے دستخط کر دیے" [2]،اس کی موٹر والی آواز جھنجھناہٹ اور جھاگ کے ساتھ اٹھتی ہے اور وقفے وقفے سے، انجیکشن فریکوئنسی کے ساتھ بہتی ہنسی، اور جب بھی وہ کوئی بات چیت شروع کرنا چاہتا ہے، یا کسی اور کو ختم کرنا چاہتا ہے، یا کسی چیز پر تبصرہ کرنا چاہتا ہے، یا کسی پوزیشن پر تنقید کرنا چاہتا ہے، چاہے وہ کچھ بھی ہو۔ یہ پرانے شہر کے بیچوں بیچ ٹریفک کے بحران پر تنقید ہے جہاں وہ برسوں سے ڈیرے ڈالے ہوئے ہے، پھر وہ اپنے پھٹے ہوئے کپڑوں،

---

1 ۔لفظ "پریوں کی کہانی" کا مطلب ہے کہ یہ ایک بول چال کا لفظ ہے جو فلسطینیوں میں روز مرہ کے حوالے سے استعمال ہوتا ہے، خاص طور پر بوڑھوں کے درمیان یہ لفظ "افسانہ" اور اس کے فعل سے ماخوذ ہے۔ "خرافہ" ہے جس کا مطلب ہے بتانا، بتانا، دیکھنا اور پہنچانا۔

2 سارڈینز کے کین ڈبے میں بند سارڈینز کے کین کا حوالہ ہے جو صہیونیوں کے ہاتھوں فلسطینیوں کو ان کی آفات، سانحات اور بار بار اپنے وطن سے باہر بے گھر ہونے کے درمیان بین الاقوامی امداد کی صورت میں تقسیم کیے گئے تھے۔

اپنی گہرے سبز جیفری ٹوپی، اور اپنے ٹھوس موسم سرما کے فوجی کوٹ میں اڑ جاتا ہے۔ گرمی کے شدید ترین دنوں میں بھی نہیں اتارتے اور اس کے پیچھے اپنے پرانے جملے اڑاتے ہیں جو اس کے دہرانے کے باوجود اس کے منہ سے نہیں نکلتے اور میری یاد میں عزیز اطہر کے کونے سے میری دادی کی تصویر ابھرتی ہے۔ اس کی شام اور صبح کی کہانیاں ختم کرتی ہیں اگر ہم دوپہر میں ان میں سے ایک کو بیان کرتے ہوئے اس پر اصرار کریں: "اور پرندے اڑ گئے اور بھلائی کی تلاش کریں۔"

جب ہم اِس بات پر اصرار کرتے کہ وہ ہمیں پرانے شہر کے وسط میں ایک پاگل آدمی کی کہانی دوبارہ سنائے جِس کا مشہور جملہ تھا، "انہوں نے اسے سارڈینز کے ایک ڈبے کے عوض بیچ دیا اور وہ گر گئے،" تو ایک ہی کہانی کو درجنوں بار دہرانے پر مجبور ہونے کے خلاف احتجاج کے طور پہ وہ شکست خوردہ ہونٹوں کو دباتے ہوئے ہمیں کہتی ہے کہ"ابو عرب کا افسانہ سب سےحیرت انگیز ہے، میرے بچو! کیونکہ اُس کا نام ابو

ہے، اور وہ - خدا کی طرف سے - فلسطین میں ہمارے گاؤں کے نوجوانوں کی زینت تھا"۔ وہ ساری زندگی ایک گوریلا بنا رہا، اورپہاڑوں میں گھومتا رہا، اور صہیونی فوج کو اُس کا سر ہمیشہ سے مطلوب تھا، لیکن کوئی بھی اسے گرفتار نہیں کر سکا تھا۔ بالآخرسنز آف سیکرڈ ٹریٹرز (Sons of Sacred Traitirs) نے اُسے گرفت میں لے لیا، اور اُسے صہیونی جیل میں طویل عرصے تک تشدد کا نشانہ بنایا گیا، لیکن اُس نے ثابت قدمی اور عزم کے ساتھ اپنے انقلابی عہدوں کو برقرار رکھا، اور ایسی کوئی بھی معلومات فراہم کرنے سے انکار کر دیا جس سےکوئی بھی شناخت ظاہر ہو۔ اپنے انقلابی بھائیوں میں سے جب وہ جیل سے نکلے تو اسے یہاں جلاوطن کر دیا گیا تھا، اوراسے یقین تھا کہ وہ اپنے عرب خاندان میں رحم کرے گاکیونکہ وہ خود کو ابو عرب کہتا تھا۔ عربوں نے اس سرزمین پر قدم رکھا تو وہ ایک فلسطینی لڑاکا ہونے کے الزام میں ایک طویل عرصے تک عربوں کی جیل میں رہا، یہاں تک کہ لوگ اُس کے بارے میں مکمل طور پر بھول گئے۔ اور جب وہ جیل سے باہر آیا تو

وہ اپنی جوانی، اپنی یادداشت اور اپنی جدوجہد سے محروم ہو چکا تھا، اِس لیے لوگ سب کچھ بھول گئے سوائے فلسطینیوں کو بے گھر کرنے کے جرم، غداروں کی قابض افواج اور غداروں کے ساتھ ملی بھگت کے۔ اُس نے اپنے ایک ہی جملے کے علاوہ کبھی کچھ نہیں کہا، "انہوں نے اسے سارڈینز کے ایک ڈبے کے عوض بیچ دیا اور انہوں نے اس پر دستخط کیے" جسے وہ زندگی کی ہر صورت حال کے لیے دہراتے ہیں، کیونکہ یہ اس کے خون بہنے والے زخم کو بھرےبغیر فلسطینی عوام کے دکھ کا خلاصہ کرتا ہے۔ میرے بچو! ابو عرب جوان تھا اور رہے گا، چاہے وہ پاگل ہی کیوں نہ ہو جائے، اور گلیوں میں گم ہو کر بے گھر ہی کیوں نہ ہو جائے۔

اور چونکہ میں نے اپنی دادی کے کہے ہوئے ہر لفظ کی سچائی پر پورا بھروسہ کیا تھا جن کو تین بار بارگاہِ الٰہی میں جانے کا اعزاز حاصل تھا تو میں نے بھی ابو عرب کی تعظیم اور تعریف کی، بلکہ خاموشی اور رازداری کے ساتھ اُس سے شدید ترین محبت کی۔ کیونکہ میں

اُسے فلسطینی جدوجہد کی علامت کے طور پر دیکھتا تھا، اور میں نے عزم کیا تھا کہ جب بھی میں اسکول جاتے ہوئے اُس کے پاس سے گزروں گا تو اُس کو دیکھتا رہوں گا۔ میں نے یہ خطرہ مول لیا تھا یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ میرا پیچھا کرے گابالکل اُن بچوں کی طرح جو اُس کا پیچھا کر کے اُسے تنگ کرتے ہیں اور پتھرمارتے ہیں۔ لیکن اُس نے میرے ساتھ ایسا کبھی نہیں کیا، کیونکہ اپنے ذہن سے باہر ہونے کے باوجود وہ ایک سمجھدار آدمی تھا۔ جب میں نے اُسے سلام کیا تو وہ خاموش رہنے پر مطمئن ہو گیا،اور پھر اُس نے اپنا وہ مشہور جملہ دہراتے ہوئے وہاں سے کُوچ کرنے کا ارادہ کیا اور چھوٹی سی جمود والی گلی نے اُس جملے کو ایک گونج کے ساتھ دُہرایا۔۔۔

اور جب اُسے ایک سرد، ٹھنڈ والی رات میں کسی نامعلوم گاڑی نے ٹکر مار کر سڑک کے کنارے خون کے جمے ہوئے ٹکڑوں سے ٹپکتا ہوا ایک بے جان وجود سمجھ کرچھوڑ دیا تو میری دادی نے اُس نامعلوم کے لیے پریوں کی کہانی بننے سے انکار کر دیا۔ وہ ایک ہیرو تھا

اور میں نے اُس کے لیے ایک ایسا انجام تخلیق کرنے کا تہیہ کر رکھا تھا جو اس کی قابلِ فخر سنہری روح کے لائق ہو۔ ابو عرب باقی تمام انسانوں کی طرح سے ختم نہیں ہو سکتا تھاکیونکہ اُس کے جسم کو اس کی وحشی،اور غیر متزلزل بھوک کے ساتھ نہیں کھایا جا سکتا تھا تو اِس لیے اُس کے افسانے کا شاندارد اختتام ضروری ہے۔ وہ یہ کہنے لگا کہ ابو عرب مرا نہیں ہے بلکہ وہ فلسطین میں چھپ کر واپس آیا تھا اور وہ وہاں ایک بہادر گوریلا آپریشن میں شہید ہوا، اور شمالی فلسطین کے پہاڑوں میں ایک خفیہ مقام پر دفن کیا گیا۔ اوراب ہر رات اُس کی روح وہاں سے نکلتی ہے، ہتھیار اٹھاتی ہے اور مردانہ وار لڑتی ہے، اور اسی طرح لڑتی رہے گی جب تک کہ وہ قیامت کے دن اپنے ہتھیار اور اپنی جان لے کر دوبارہ زندہ نہ کیا جائے گا، اور یہ دہرائے گا کہ "خدا عظیم ہے، فلسطین آزاد ہے اوروہ ابو عرب ہے۔"

ہم سب، خود، میرے بھائی، میرے کزن، پڑوسیوں کے بچے اور اسکول میں ہمارے ہم جماعت، سردی کی اس

سرد رات میں ابو عرب کے المناک انجام پر یقین نہیں رکھتے تھے، اور ہم نے اپنی دادی کی کہانی پر یقین کیا تھا کیونکہ وہ جھوٹ نہیں بولتی تھیں، اور ابو عرب اِسی شاندارموت کا مستحق ہے، اور اُس کی روح اب فلسطین کے جنگلوں میں خوشی سے دوڑ رہی ہوگی۔

جہاں تک اس کے سائے کا تعلق ہے تو وہ سفید پتھروں سے بنی ہوئی پکی سڑکوں پر چلتا رہتا ہے، اور میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں اُس سے سینکڑوں بار ملا ہوں،اور اِس سے بھی زیادہ تکبر کے ساتھ جب میں نے اُسے سلام کیا تو وہ مسکرایا اور سر ہلایا اور پلک جھپکتے ہی غائب ہو گیا۔ پھر میں جو چاہتا ہوں کہ پیچھے مڑ کر اُسے دوبارہ دیکھوں لیکن اِس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے کہ میری روح مجھے ایسا کرنے کی کتنی ہی تاکید کرتی ہے---

میرا خیال تھا کہ ابو عرب بھی میری دادی کی طرح مر جائے گا جو ایک شام کی نماز ادا کرنے کے بعد اور اسی سردی میں فلسطینی زیتون کے گرم تیل سے اپنے پیروں کی مالش کر کے مر گئی تھی، لیکن "وہ نہیں مراتھا"۔

میں نے اُسے ہر جگہ موجود پایا، اور ایسی بہت سی جگہیں تھیں جہاں میں اُس کے پاس گیا تھا، اور یہ احساس کتنا خوبصورت ہے کہ ابو عرب ایک فینکس کی طرح ہے،اور وہ مرتا نہیں ہے---

وہاں، اردن، شام، لبنان اور فلسطین میں بے گھر فلسطینیوں کے کیمپوں میں، میں اُس سے ایک ہزار بار آمنے سامنے آیا تھا اور کبھی کبھی تووہ میڈیا میں کوریج کے لیے میری تلاش کے نتیجے میں مجھ سے ملتے تھے۔ بین الاقوامی خبر رساں ایجنسی میں، اپنی ملازمت کی وجہ سے اُن جگہوں پر بے گھر فلسطینیوں کے حالات کو دیکھتا تھا، جہاں میں اقوام متحدہ کے امدادی ادارے برائے اساتذہ کے ادارے سے انگریزی میں مہارت حاصل کرنے کے بعد سے کام کر رہا ہوں، اور وہ مجھے اکثر ملتے رہتے تھے۔ میں اپنے متجسس وجود کے ساتھ سرحدوں والے ممالک کے درمیان پیدل، اکیلے یا دوستوں، رشتہ داروں، یا ساتھی کارکنوں کے ساتھ سفری فیسوں میں ذاتی پیسے خرچ کرتا تھا خاص طور پر اپنے متواتر شٹل دوروں کے دوران، جو میری زیادہ تر تنخواہ اور بچت کو کھا جاتے تھے۔

لیکن میں اِس ساری کوشش، تکلیف اور انتظار کی پرواہ نہیں کرتا تھا جب تک کہ میں ابو عرب سے روبرو ہوتا، اور ہر بار اُس کے پاس ایک توہم پرستی تھی جو اس بات کی تصدیق کرتی تھی کہ اسے ایک من مانی تقدیر کے لیے پیدا کیا گیا ہے، جو کہ ہونا ہی تھا۔ ابو عرب اپنی نئی جدوجہد اور باوقار انجام کے ساتھ میرے ساتھ چپکے چپکے کھیل کھیلتے تھے لیکن جب بھی میں نے ان سے دریافت کیا تو وہ اس طرح ہنستے تھے جیسے میں نے انہیں کبھی ہنستے نہیں دیکھا تھا۔ اپنی پہلی زندگی میں اُس سے پہلے کہ وہ لافانی میں اڑتی ہوئی روح میں بدل گیا، اور اس نے پھر یہ کہا کہ"انہوں نے اسے سارڈینز کے ایک ڈبے میں بیچا اور انہوں نے دستخط کیے،" اور پھر وہ غائب ہو گیا جب تک کہ وہ مستقبل قریب میں دوبارہ ظاہر نہ ہو گیا۔

ابو عرب مردوں، عورتوں اور بچوں کا لشکر بن گیا تھا اور وہ تو فلسطینی عورتوں کے پیٹوں میں چھپا ہوا تھا جو اپنے یتیم بچوں کو دودھ پلاتی تھیں، اور میں نے اُسے زمین کے پتھروں میں چھپا ہوا پایا تھا جو یہ پکارتا

تھا، "اے فلسطینی"!!! میرےبچو!میں نے اُسے دیکھا اور جب میں ماؤں کے نعرے سن رہا تھا تو مجھے ابو عرب کے قہقہے کی آواز واضح طور پرسنائی دے رہی تھی۔ ایک دفعہ حضر ت اُمِ غالب نے زیتون کے درخت کو گلے لگا اسے اکھاڑ پھینکنے کے لیے صہیونی بلڈوزر پر چھوڑ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ جیسا کہ انھوں نے کچھ دن پہلے اپنے بیٹے کے ساتھ کیا تھا اور پھر وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور دنیا کی آنکھوں کے سامنے تباہی پھیرنے والی صہیونی مشین سے کہا، "بوڑھا اور ثابت قدم"۔

جب فلسطینی مزدوروں کو اپنے اور اپنے اہل خانہ کے لیے باعزت زندگی گزارنے کے جرم میں صہیونی چوکیوں پر قتل کیا گیا تو ان سب کا مسکراتا ہواچہرہ شہادت کے خوبصورت احساس سے بھرا ہوا تھا۔ صیہونیوں کو یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ کس کا چہرہ ہے لیکن تمام کھوپڑیوں میں چہرہ صرف اُسی کا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ یہ "ابو عربی" کا چہرہ ہے۔

ابو عرب کے جتنا قریب ہو سکتا تھا میرے عزم نے مجھے بہت اہم، نایاب اور غیر معمولی میڈیا پیشکشیں

حاصل کیں، اور مجھے سب سے مشہور، بین الاقوامی اور اچھی طرح سے احاطہ کرنے والی نیوز میڈیا ایجنسیوں میں کام کرنے کے لیے تیار کیا، اور یہ ایک مقبول ہفتہ وار پروگرام بن گیا۔ یہ اُن تمام لوگوں کے لیے اشتعال انگیز تھا جو ابو عرب نہیں ہو سکتے تھے، اور میں نے اِس پروگرام کا نام ہی"ابو عرب کی پریوں کی کہانی" رکھا تھا،اور اس پروگرام کی ہر قسط ثابت قدمی کے محاذ پر فلسطینی ہیرو یا ہیروئن کے بارے میں تھی۔ بظاہرسطح پر مختلف، لیکن اندر سے وہ سب 'ابو عرب 'کے لیے تھے۔

ایک دفعہ ابو عرب کا نام دلال المغربی تھا اور ایک بار وہ اپنی غیر عربی زبان میں اسلامی گیت گا رہے تھے، اِس سے پہلے کہ وہ شہادت کا آپریشن کرتے، اورکبھی اُن کا نام آصف محمد اور کبھی عمیر خان شریف۔ وہ ہر کہانی کا مرکزی کردار تھے۔

ابو عرب تمام ناموں اور تمام چہروں کے مالک تھے اور میں ہر جگہ، زمانہ اور عمل میں اس سے واقف نہیں تھا، لیکن میں جانتا تھا کہ وہ کبھی ہاشم النجر تھے اور وسری

بار وہ محمد صلاح حبیشی تھے۔ ، محمد فرحت، حاتم السیسی، عماد اکل، اور راعد زکرنیہ، اور علاء ابو ظیم، ریم الریاشی، اور النجار، اور میں اُن کی حکمت پر حیران رہ گیا جب اس نے یحییٰ عیاش کا ذریعہ ایجاد کیا۔ شہادت کی کارروائیوں میں بوبی ٹریپنگ اور الیکٹریکل سرکٹ؛ پھر اُس نے موبائل فون کے ذریعے ریموٹ بمباری کی ٹیکنالوجی ایجاد کی جب وہ محی الدین الشریف تھے، اور میں نےاُن کی اِس کی ہمت پر جس طرح پوری دنیا نے خوشی کا اظہار کیا، جب وہ... اکیلے ہی صہیونی مشرک کا مقابلہ کرتا ہے، اور رام اللہ میں جب سلیمان زیدان تھے، یا بیسان میں جب وہ سحر التمام تھے، یا نیتنیہ میں جب اُن کا نام عبدالباسط عودیہ تھا، یا جب انہوں نے فلسطین میں اپناپہلا مقامی طور پر تیار کردہ میزائل لانچ کیا تھا۔ اُس وقت وہ ندال فرحت کے کردار میں تھے جب فلسطین میں بنائے گئے پہلے طیارے کی تیاری مکمل کرنے سے پہلے اُن کو قتل کر دیا گیا تھا۔ اُن کی شہادت پر میں کتنا مظلوم اور مایوس ہوا، اور اُس کی ویڈیو ریکارڈنگ سن کر میں کتنا رویا

اور دنیا میرے ساتھ روئی۔ اپنی والدہ سے مخاطب ہو کر کہے گا کہ وہ غمگین نہ ہوں اور اس پر فخر کریں، اور وہ اس وقت ایک خوبصورت فلسطینی نوجوان تھا جو زندگی، تندرستی اور صحت سے بھرپور تھا، محمد فرحت!۔

ابو عرب نے مجھے ہر جگہ پا کر میرا دماغ خراب کر دیا تھا، وہ قبرستانوں میں شہیدوں کا ماتم کر رہا تھا اور انہیں حساب کتاب کے فرشتوں کو جواب دینے کا طریقہ سکھاتا تھا۔ اور وہ آخری شخص تھا جس نے فصل کی کٹائی کے موسم میں دیواروں پر اُس کی روشن اور قابل فخر تحریر کو اس جملے سے پہچانا کہ "فلسطین آزاد ہے اور عرب ہے اور فجر کی نماز کی پہلی صفوں میں"۔ وہ اپنی جگہ لیتا تھا جو پرانے یروشلم میں چرچ کی گھنٹیاں بجاتا تھا، اور وہ وہی تھا جو نوزائیدہ بچوں کے کانوں میں اذان دیتا تھا۔

میں نے ابو عرب کو گلے لگانے کی بہت کوشش کی تھی، یہاں تک کہ اپنی زندگی میں اسے یہ بتانے کی کئی بارکوشش کی لیکن میں اُن سے وہ بات نہیں کہہ سکا

جب میں جوان تھا،اور میں انہیں کہنا چاہتا تھا کہ اےابو عرب! "میں آپ سے بے حد پیار کرتا ہوں" لیکن ہر بار وہ مجھ سے اپنی قسمت کی طرف بھاگے جس نے اسے پوری زمین کا مسافر بننے پر مجبور کیا، اور میرے لیے اُس کا تعاقب کرنے والا جو کوئی آرام یا سکون نہیں جانتا، اور اس تعاقب میں، میں نے اُس کے بہت سے رسم و رواج کو دریافت کیا تھا۔ اُس کی مختلف نوعیتیں، اُس کی متعدد زبانیں، اور اُس کی متعدد زندگیاں جو ہر اُس دل میں موجود تھیں جو فلسطینی مقصدکے انصاف پر یقین رکھتا تھا۔۔

مجھے خوشی ہوئی جب مجھے معلوم ہوا کہ ابو عرب اکیلے نہیں رہتے تھے اور نہ ہی وہ کٹے ہوئے مرے تھے، جیسا کہ میں نے سوچا تھا، اور جیسا کہ میری دادی نے مجھے اپنے افسانے کے بارے میں بتایا تھا، بلکہ ہزاروں عورتیں تھیں جن سے انہوں نے شادی کی تھی۔ ان کے تمام نام اُمِ عرب تھےتو کیا وہ ابنِ ابی عرب بھی ہو سکتے ہیں؟ اس پاگل سوال کے حل کے طور پر جو حقیقت کو نہیں سمجھتا، میں نے تمام بچوں کے ساتھ

اِس بنیاد پر معاملہ کیا کہ وہ ابو عرب کے بیٹے ہیں اور میں ہر اُس بچے کو اُس کی کہانی سناتا رہا جس سے میں ملتا تھا کہ میں جانتا ہوں کہ وہ کون ہوگا؟، اور میں تصور کرتا ہوں کہ وہ ایسا ہی کرے گا۔

میرا اگلا پروجیکٹ ابو عرب کے تمام افسانوں کو بچوں کے لیے ایک جامع کہانی کی کتاب میں ریکارڈ کرنا تھا تاکہ وہ پڑھ سکیں کہ انہیں مستقبل میں کیا ہونا چاہیے، لیکن غزہ کی پٹی میں اِس فوری میڈیا مشن نے مجھے اپنا کاغذ، اور قلم اپنی میز پر چھوڑدینے پر مجبور کر دیا تھا۔ اور دنیا کو صہیونیت کے جرائم سے آگاہ کرنے کے لیے وہاں پر اڑنا، میرا مطلب ہے کہ بے دفاع فلسطینیوں کے معاملے میں، میرا مشن میدان میں جو کچھ ہو رہا تھا اس کی تصویر کشی کرنا نہیں تھا۔ لیکن میں نے ایسا کرنے کا تہیہ کر رکھا تھا کہ خدا کے سامنے اور پوری دنیا کے سامنے میری عینک سے ایک ہی دن میں ہزاروں بار ابو عرب کی تصویریں اتر یں۔ ۔ اور آخر کار توپوں کے گولے جو میرے پاؤں کے قریب چھلانگیں لگا رہے تھے وہ زمین پر شہید ہو گئے اور اس غدار

لمحے میں صرف میرا کیمرہ ہی میرے ساتھ وفادار رہا۔میں نے ابو عرب کو بھاگتے ہوئے دیکھااور میرے پاؤں سےبہت زیادہ خون بہہ رہا تھا، اور ایک چھیدنے والا درد جو خود کو میرے خلاف وحشیانہ میزائلوں سے ہمکنار کرنے میں شرم محسوس نہیں کرتا تھا۔ اور ابو عرب کے سب سے اہم اور ابدی پُراسرار رسم و رواج کو مدنظر رکھتے ہوئے، میں اپنے شدید درد پر طنزیہ انداز میں مسکرایا، اور حیرت سے پوچھا کہ اے میرے بیٹے ابو عرب! اب کیا دیکھ رہے ہو؟ وہ کچھ دن پہلے ہی اس دنیا میں آیا تھا، اور میں نے اسے جُھولے میں بولتے ہوئے سنا تھا کہ ''ابا، ٹھہرو!'' لیکن افق پر، وقت کا دروازہ کھل رہا تھا۔ اس سے بے گھر فلسطینیوں کی فوجیں تازہ کنول کی طرح نمودار ہوئیں اور اس کے لیے زمین کی جڑیں کھل گئیں کہ اس کے مُردہ فلسطینی اپنے وطن میں اپنے ابدی آرام کے لیے لوٹ رہے ہیں۔ جب کہ میری دادی میرے دائیں طرف بیٹھی مجھے ابو عرب کی پریوں کی کہانی سنا رہی تھیں جسے میں پسند کرتا ہوں۔ شاید یہ مجھے میرے شدید درد سے غافل کر دے، جس

طرح اُس نے مجھے جوان ہونے میں میری بھوک اور بیماری سے غافل کیا تھا، اور میں نے اپنے بائیں طرف سے ایک اور صہیونی میزائل کو مجھے نشانہ بناتے ہوئے دیکھا، بلکہ ابو عرب سے مراد اِس وقت میرا نام اور اُس کا نام عماد غنیم تھا، جو فلسطینی الاقصیٰ چینل (3) کا کیمرہ مین تھا، اور خاموشی چھا گئی، اور تمام تصویریں غائب ہو گئیں، اور آخر کار ہم ابدی، اور مزیدار سی خاموشی سے مغلوب ہو گئے تھے۔

ڈاکٹر سناء شعلان (بنت نعیمہ) مختصراً

ڈاکٹر سناء شعلان (بنت نعیمہ)، جنہیں عربی ادب کا سورج، عربی افسانے کی خاتون، اور عربی ادب کی علامت کا نام دیا جاتا ہے، ایک اردنی مصنفہ، علمی، اور فلسطینی نژاد میڈیا کی شخصیت ہے، اسکرپٹ رائٹر ، پریس نامہ نگار، انسانی حقوق، خواتین، بچوں اور سماجی انصاف کے مسائل میں ایک کارکن کے طور پر انہوں نے اردن یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ہے۔ ادب اور ادبی تنقید میں امتیاز کے ساتھ وہ بہت سے ادبی، علمی اور میڈیا فورمز کے ساتھ ساتھ مقامی، عرب اور بین الاقوامی تحقیقی اور قانونی اداروں کی رکن بھی ہیں.

وہ ناولوں، مختصر کہانیوں، بچوں کے ادب، سائنسی تحقیق، تھیٹر، سفری ادب، تقابلی ادب اور میڈیا کے شعبوں میں تقریباً

66 بین الاقوامی، عرب، مقامی اور علاقائی ایوارڈز جیت چکی ہیں.

ان کی 75 شائع شدہ کتابیں ہیں، جن میں ایک خصوصی تنقیدی کتاب، ایک ناول، ایک مختصر کہانیوں کا مجموعہ، بچوں کی کہانیاں، ایک تھیٹر اسکرپٹ، اور ایک سفر نامہ شامل ہیں، جن میں سیکڑوں مخطوطات کا ایک بڑا حصہ ہے جو ابھی تک شائع نہیں ہوا ہے۔ شائع شدہ مواد میں مطالعات، مضامین، اور تحقیق کے علاوہ بہت سے مقامی، عرب، اور بین الاقوامی اخبارات اور رسالوں اور سیریز اور فلموں کے اسکرپٹ شامل ہیں.

ان کی سائنسی، ثالثی اور میڈیا کمیٹیوں میں رکنیت کے علاوہ ادب، تنقید، انسانی حقوق، ماحولیات، سماجی انصاف، عرب ورثہ، انسانی تہذیب اور تقابلی ادب کے مسائل پر مقامی، عرب اور بین الاقوامی کانفرنسوں میں بھرپور شرکت ہے.

وہ بہت سے ثقافتی اور قانونی اداروں کی نمائندگی کرتی ہیں اور بہت سے عرب اور بین الاقوامی ثقافتی اور فکری منصوبوں میں شراکت دار بھی ہیں.

ان کی تصنیفات کا کئی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے، اور انہوں نے بہت سے اعزازات، شیلڈز، اعزازی ٹائٹلز، اور ثقافتی، سماجی اور قانونی نمائندگییاں حاصل کی ہیں.

ان کا تخلیقی پروجیکٹ اردن، عرب دنیا اور باقی دنیا میں بہت سے تنقیدی اور تحقیقی مطالعات، ماسٹرز اور ڈاکٹریٹ کے مقالوں کا میدان ہے.

مصنف سے رابطہ کرنے کے لیے: ڈاکٹر سناء شعلان
(بنت نعیمہ)
الأردن- عمان- الرّمز البريدي: 11942
ص. ب: 13186
خلوي وواتس وفايبر: 00962795336609
البريد الإلكترونيّ: selenapollo@hotmail.com
Facebook: sanaa shalan
Youtube: sanaa shalan (سناء الشعلان)

ڈاکٹر: لبنیٰ فرح

آپ مکہ مکرمہ سعودی عرب میں پیدا ہوئیں ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی۔کچھ عرصہ بعد پاکستان منتقل ہو گئیں۔ یہاں آپ نےNUMLسے عربی کی ڈاریکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی اور اسلامک انٹرنیشنل یونیورسٹی میں لیکچرر مقرر ہوئیں بعد میں آپ نےNUMLمیں شمولیت اختیارکیاور آپ نےNUMLکے شعبہ عربی میں بطور اسسٹنٹ پروفیسرخدما ت سر انجام دے رہی ہیں۔آپ صرف عربی زبان کی بہتری مُدرسہہیں بلکہ آپ کو ترجمہ کاری میں بھی خصوصی مہارت حاصل ہے آپ کی اس شعبہ میں مہارت کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جاستا ہے کہ آپ اس شعبہ میں نہ صرف چھ کتابوں کی مصنفہ ہیں بلکہ آپ نے مختلف سفارتی مشنزکے ساتھ مترجم کے فرائض بھی سر انجام دیے ہیں جس

میں صدارتی سطح ملک کے اعلیٰ سطحی مشنز شامل ہیں۔آپ کی زیر نظر کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔یہ مختصر کہانیوں پر مشتمل ایک ضخیم کتاب ہے اور یہ تمام کہانیاں فلسطین سے متعلق ہیں جس میں فلسطین کے درد کو بہت ہی احسن اور منفرد انداز سے اجاگر کیا گیا ہے ان میں نہ صرف فلسطینیوں پر ہونے والے ظلم وجبر کو دنیا کے سامنے لایا گیا ہے بلکہ اسرائیل کی بربریت کو بھی خوب نمایاں کیا گیا ہے۔آپ نے ان کہانیوں میں صرف اہل فلسطین اور ظالم یہود کو عنوان ہی نہیں بنایا ہے بلکہ آپ نے باقی دنیا بالخصوص اہل مغرب کی منافقت کا بھی خوب پردہ چاک کیا ہے جیسا کہ اس کتاب کی سب سے پہلی کہانی ہی اس بات کی خوب تمازی کرتی ہے کہ کس طرح مکار یہودی ظالم ہو کر بھی مظلومیت کا لبادہ اوڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں اور ان کے مغربی حامی نہ صرف انکی حرکتوں پر خاموش ہیں بلکہ ڈھٹائی کے ساتھ نہ صرف ان کے ہم نوائی میں مصروف ہیں بلکہ کھلم کھلاانکی حمایت اور مدد میں مصروف ہیں۔آپ نے ان کہانیوں میں نہ صرف حالات و واقعات کی عکاسی کی ہے بلکہ آپ نے جذبات و احساسات

کی بھی ایسی درست ترجمانی کی ہے کہ قاری خودکو فلسطین کا حصہ سمجھنے پر مجبورہو جاتا ہے اور کوشش کے باوجود وہ اپنی آنکھوں کو نم ہونے سے نہیں روک پاتا ہے اور دراصل یہی ایک لکھاری کا اپنے قاری پر گرفت کا منہ بولتاثبوت ہوتا ہے یعنی قاری لکھاری کی گرفت سے اپنے آپ کو آزاد نہیں کر پاتا ہے وہ وہی سوچتا ہے جو لکھاری چاہتا ہے حتیٰ کہ اسکی مسکراہٹ اور غمگینی،شگفتگی اور افسردگی چہرے کی کھلکھلاہٹ اور آنکھوں کی تمناکی تک لکھاری کے الفاظ قبضہ کر لیتے ہیں اور وہ انکے سحر سے آزاد نہیں ہو پاتا۔آپ کی مختصر کہانیوں کی یہ کتا ب ان اوصاف سے پوری طرح مزین ہے اور اس بے حسی کے دور میں اہل فلسطین کے حق میں ایک توانا آواز ہے جو دنیا کو خاص طورپرنوجوان نسل کو جو کہ اب سوشل میڈیا زیر اثر ہے جس پر اہل یہود کا ہی قبضہ ہے اہل فلسطین کی حالت زار مظلومیت اور بے بسی سے آگاہ کر رہی ہے بلکہ ظالم قوتوں کیلئے بھی ایک تازیانے کا کام کررہی ہے۔اللہ تعالیٰ آپ کی اس کاوش کو اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے اور اسے مقبول عام فرمائے۔(آمین)

ڈاکٹر: لبنیٰ فرح

ڈاکٹر: سناء شعلان

9 789957 545802
Sanaa Kamel Shalan

ALTNOOR
النور
Culture and Art للثقافة والفنون